اندیشوں کے گرفتار

مائل خیرآبای

اِنتساب

اندیشوں کے گرفتاروں کے نام

مائلؔ خیرآبادی

فہرست

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ط

عتابِ الٰہی

یہ عربی زبان کا شاہکار افسانہ ہے جسے ترمیم اور اضافے کے بعد خصوصًا ایک کردار بڑھا کر اردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔

وہ جلد سے جلد شہر میں پہونچ کر اجتماعِ عام میں شریک ہونا چاہتے تھے انھوں نے سوچا تھا کہ شام تک شہر کے اندر داخل ہو جائیں گے۔ امیر شہر کے یہاں دعوت کھائیں گے۔ رات کی پُرسکون فضا میں آرام کر کے سفر کی تکان مٹائیں گے۔ پھر دوسرے دن کارکنوں کے خاص اجتماع میں اپنے حلقۂ مشرقِ وسطٰی کی تبلیغی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کریں گے۔ اپنے گزشتہ منصوبے کا جائزہ لیں گے اور آئندہ کے لئے منصوبہ بنائیں گے۔ وہ سب ملا کر مشرق وسطٰی کے چالیس۴۰ نمائندے تھے جو مراقش میں ہونے والے ایک عظیم مسیحی اجتماع میں شرکت کرنے

کے لئے جا رہے تھے، ان کے ساتھ ایک خدمت گار بڑھیا بھی تھی جسے انھوں نے اس کی درخواست پر ساتھ لے لیا تھا۔

چلتے چلتے انھوں نے محسوس کیا کہ دوپہر کے بعد سورج کی رفتار معمول سے زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ شام تک شہر میں نہ پہونچ سکیں گے الاّ یہ کہ سب تیز چلیں ــــ امیر سفر نے سب کو تیز چلنے کا حکم دیا۔ رواں دواں قافلے نے اپنی رفتار بڑھانے میں پوری قوت لگا دی۔ خدمت گار بڑھیا بھی پیچھے پیچھے سب کے ساتھ تھی اس کے لئے مشکل یہ بھی تھی کہ وہ کئی مبلّغین کا سامان بھی سر پر لادے تھی۔ وہ بار بار بہت پیچھے رہ جاتی اور اس کے لئے سب کو ایک لمحہ ٹھہر جانا پڑتا وہ دل میں تو خوش ہوتے کہ اس بہانے ستانے اور دم لینے کے لئے کچھ موقع مل جاتا ہے لیکن جب امیر سفر بوڑھیا کو ڈانٹتا تو سب بھی اپنے امیر کی تائید میں اس ضعیف کو بُرا بھلا کہنے لگتے۔ بوڑھیا انھیں دعائیں دیتی اور پیچھے پیچھے گھسٹتی جاتی۔

اس طرح سب مراقش کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ عصر کے وقت اچانک سب نے ایک عجیب سی بھیانک آواز سنی۔ مبلّغ گھبرا گئے پھر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ انھوں نے اسے بھونچال محسوس کیا۔ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے گردش کرتے کرتے اپنا محور چھوڑ دیا ہو زمین کی یہ کیفیت صرف چند لمحے ہی رہی۔ ان لمحوں کے گزر جانے کے بعد سب نے دیکھا کہ سورج کی چمک دمک ماند پڑنے لگی۔

جُھلسا دینے والی ہوا کے تیز جھونکے سرد ہونے لگے۔ دیکھتے دیکھتے بادل گھر آئے پھر تاریکی اتنی بڑھی کہ راستہ چلنا دوبھر ہو گیا۔ امیرِ سفر نے حکم دیا کہ اس عذاب سے بچنے کے لئے سامنے والے منہدم معبد میں پناہ لو اس کے حکم کے ساتھ سب اسی طرف لپکے اور کسی نہ کسی طرح معبد کی ایک کوٹھری میں گھس گئے۔ مڑ کر دیکھا تو محسوس کیا کہ جیسے ساری کائنات بحرِ ظلمات میں ڈوبی جا رہی ہو۔

اس کے بعد کالی گھٹاؤں کے غول سارے آسمان پر چھا گئے پھر بوندا باندی شروع ہو گئی اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گھنگھور گھٹاؤں میں بجلیوں کی کڑک اور چمک اور بادلوں کی دل ہلا دینے والی گرج پیدا ہو گئی بجلیاں اس تیزی سے کوندنے لگیں جیسے آسمان پر عذاب کے فرشتے تلواریں چمکا رہے ہوں۔

مبلّغ معبد کے کونوں میں دبک گئے بڑھیا کو دروں کے سامنے جگہ مل گئی۔ وہ کانپتی ہوئی اپنے سامان کے بیچ بیٹھ گئی گھٹنے کھڑے کر کے دونوں ہاتھوں سے اس طرح سے جکڑ لیا کہ وہ خود ایک گٹھڑی سی بن کر رہ گئی اندھیرا ایسا تھا کہ کوئی کسی کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ اِلّا یہ کہ بجلی کوندتی اور اس لمحے وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔

کچھ دیر کے بعد امیرِ سفر نے چقماق سے قندیل روشن کی۔ اس نے کوئی وظیفہ زیرِ لب پڑھا اور اپنے پورے راہبانہ جاہ و جلال کے ساتھ گویا ہوا۔

”میرے مسیحی بھائیو! نہ تو یہ صحرا کی آندھی ہے نہ ریگستانی بارش اور نہ یہ عام

طوفان ہے۔ دیکھو مجھ سے کوئی کہہ رہا ہے کہ کوندنے والی یہ غضبناک بجلیاں یہ گرگڑانے والے دندناتے اور دل ہلانے والے بادل اور یہ بحرِ ظلمات سے زیادہ تاریک رات سب کے سب مل کر قدرت کے شدید انتقامی ردِّ عمل کو ظاہر کر رہے ہیں۔ مسیحی بھائیو! یہ عتابِ الٰہی ہے، قہرِ خداوندی ہے۔ آسمانی عذاب ہے جو ہم پر نازل کیا گیا ہے۔ ہم چالیس ساتھیوں میں ضرور کوئی گنہگار ہے جس کے گناہوں کی پاداش میں آسمانی غضب نازل کیا گیا ہے بتاؤ، ہم میں وہ کون گنہگار بندہ ہے؟

رئیس المبلّغین کی یہ تقریر سُن کر سب رونے لگے اور اپنی اپنی جگہ سمٹ گئے۔ اس نے پھر گرج کر کہا۔" آسمانی عذاب تمہارے رونے سے ٹل نہیں سکتا۔ بتاؤ ہم میں کون گنہگار ہے؟ دیکھو بدروحیں اس کے گناہوں پر قہقہے لگا رہی ہیں۔ موت کی پیاسی بجلیاں اس گناہگار کا خون پینے کے لئے بے قرار ہیں۔ ضرور ہم میں کوئی گناہگار ہے جسے سزا ملنی ہے دیکھو سنو! میرا فیصلہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو باری باری میدان میں جانا ہوگا۔ معبد کا طواف کرنا ہوگا اور پھر وہ سامنے والا کنواں چھو کر آنا ہوگا تاکہ جو گناہگار قابلِ عتاب ہو، قضا اُسے آدبوچے اور باقی محفوظ اور مامون رہیں ورنہ صرف ایک گناہگار کے لئے ہم سب کو نشانۂ عذاب بننا ہوگا خدا کا قہر، ہم سب پر نازل ہوگا۔ موت ہم سب کو فنا کر دے گی۔ بتاؤ پہلے کون معبد سے باہر جائے گا۔"

امیر المبلّغین سب کو بغور دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔" تم سب کو اپنی جانیں پیاری ہیں اچھا لو سب سے پہلے میں جاؤں گا۔ اور دیکھو، یہ میرے پیروں کے پاس

میرا بستر ہے اگر میں اس عتاب کی نذر ہو جاؤں تو یہ بستر میرے ورثہ تک پہنچا دینا یہ میری وصیت ہے کہ اسے کھولا نہ جائے۔ اور دیکھو میں تم کو گواہ بناتا ہوں۔ خدا نے مجھے جو علم دیا تھا۔ میں نے اسے پھیلانے میں اپنی پوری زندگی کھپا دی۔ آج تم ساری مسیحی دنیا میں میرا نام بچے بچے سے سن سکتے ہو۔ کیا تم میری اس بات کی گواہی دیتے ہو؟" وہ دوسرے مبلّغین کی طرف دیکھنے لگا۔

اے ہمارے اطراف کے مقدس باپ! آپ واقعی ایسے ہی ہیں۔ اللہ اور ابن اللہ آپ کو اس عذاب سے محفوظ رکھے۔" سب نے گواہی دینے کے ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ بڑا مبلّغ "یا مسیحؑ" کا وظیفہ پڑھتا ہوا معبد سے باہر گیا اور اندھیری رات میں گم ہو گیا۔ کوٹھری میں سمٹے ہوئے لوگ خدا جانے کیا دعا کر رہے تھے۔ ان لمحات میں جب بجلی کوندتی تو اس لمحہ بھر کی روشنی میں سب باہر کی طرف دیکھنے لگتے۔ ایک بار سب نے دیکھا کہ امیرِ سفر معبد کا طواف کر کے کنویں کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے بعد سب نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں تھیں کیونکہ بجلی کوندنے کے بعد ایک زبردست کڑاکے اور بادلوں کی گرج سے زمین کے ساتھ ان کے دل بھی ہل گئے تھے۔ مشرق سے مغرب تک آسمان میں اضطراب پیدا کر کے بجلی کنویں کے پاس سے گزر کر فضا میں جذب ہو گئی اسی لمحہ ایک سایہ نے "یا مسیح" کا نعرہ مارا کنویں کو چھوا اور بھیگتا بھاگتا معبد میں داخل ہوا۔ سب نے دیکھا کہ امیر کا چہرہ چمک رہا تھا اور اس کے چہرے پر معصومیت کا نور ہالہ کئے ہوئے تھا۔ سارے ساتھی اس کے بھیگے دامن سے چمٹ گئے اور جسے جو حصہ ملا اسے چومنے اور چومنے لگے۔

اب امیر نے اپنے نائب کو حکم دیا۔ "اٹھو، اب تمہاری آزمائش کی باری ہے"۔ عیسائی اپنے مقدس باپ کا حکم کسی حال میں ٹال نہیں سکتے تھے۔ نائب کانپتا تھرتھراتا اور روتا ہوا اُٹھا اس نے کہا میرے مسیحی ساتھیو! تم سب جانتے ہو میں انجیل مقدس کے جزو ۱۳ باب ابن اللہ کا حافظ ہوں۔ تم سب گواہی دو گے کہ میں اس کا واحد حافظ ہوں جس وقت تم آسمانی آوازیں سننا چاہتے ہو میں اس وقت کلامِ الٰہی سنا کر محظوظ کرتا ہوں میں نے اس میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میری قراءت کی گواہی مسیحی دنیا میں ہر کوچہ اور ہر گلی کی ہر اینٹ اور ہر ذرّہ دے رہا ہے۔ کیا تم بھی گواہ ہو؟"

"بے شک ہم سب گواہ ہیں"۔ سب نے کہا۔

"اچھا تو اب میری وصیت سنو۔ تم میرے بعد میرا سامان لے سکتے ہو۔ لیکن میرے سامان میں ایک سیاہ بٹوہ ہے۔ اُسے تم نہیں کھول سکتے۔ یہ بٹوہ تم واپسی کے بعد میری مطلقہ ام النحاس کو دے دینا۔"

اس وصیت کے بعد نائب دعاؤں کا وظیفہ زبان سے ادا کرتا ہوا معبد سے نکل گیا اور سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گھنگھور گھٹائیں اب بھی پورے دھماکوں کے ساتھ گرج رہی تھیں بجلیاں چمک چمک کر آنکھوں کی بصارت پہ ڈاکہ ڈال رہی تھیں۔ ایک بار کوندیں سب نے دیکھا کہ نائب معبد کے طواف کے بعد کنوئیں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کوند کے بعد صرف سایہ محسوس ہوا۔ یہ سایہ کنوئیں کے پاس پہنچا ہی تھا کہ بجلی کڑکی، چمکی، گری اور کنوئیں کے پاس سے گزر کر اندھیری فضاؤں میں جذب

ہوگئی۔ نائب بال بال بچ گیا۔

اس کے آنے کے بعد امیر نے ایک راہب کو حکم دیا کہ وہ اسی عمل کو دہرائے راہب سر سے پیر تک ایک چادر سے لپٹا ہوا تھا اس نے کہا " آپ سب جانتے ہیں اور خدا بھی جانتا ہے کہ میں ایک رئیس التجار کا بیٹا ہوں۔ میں نے دینِ مسیح کی خاطر دولت دنیا پر لات ماری اور سب کچھ ترک کر کے اس مشن میں شامل ہوا اور پھر میں نے آرام اور سُکھ کی صورت نہیں دیکھی۔ کیا آپ میرے اس اقدام کے شاہد ہیں ؟"

" ہم سب شاہد ہیں"۔ یہ شہادت لے کر راہب بھی موت سے لڑنے کے لئے نکلا اور اسی طرح زندہ وسلامت واپس آیا جس طرح اس سے پہلے اس کے دو پیشرو واپس آئے تھے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سارے مبلّغ اس سخت آزمائش سے دوچار ہوئے اور سب کے سب کامیاب ہوئے۔ امیر سفر حیران رہ گیا کہ پھر کیا بات ہے کہ یہ طوفانی عذاب ہم کو گھیرے ہوئے ہے" اب کوئی باقی نہیں رہا"۔ اس نے سوالیہ نشان سب کے سامنے پیش کیا اسی وقت ایک کوند ہوئی۔ سب نے دیکھا کہ دروں کے سامنے بڑھیا گٹھری بنی کانپ رہی ہے۔

" یہ ہے وہ گناہگار، جلد اسے دفعان کرو"۔ کئی آوازیں کوٹھری میں بلند ہوئیں اور امیر سفر نے بھی صواد کیا۔ وہ گرجا:

" او بدروح کی اولاد! تیرا خیال ہی نہ رہا۔ ساتھیو! یہی ہے حوّا کی وہ بیٹی جو اس عتابِ الٰہی کا باعث ہے۔ ہمیں اسے ساتھ نہیں لانا چاہیئے تھا۔ او سانپ کا نطفہ!

او شیطان کی ایجنٹ، اے مرد کی سب سے بڑی کمزوری! اے آدمؑ کو جنت سے نکلوانے والی! نکل ہمارے درمیان سے"۔ اور پھر امیر سفر نے بڑھیا کے ایک ٹھوکر رسید کی۔

" اے مقدس باپ اور اے پاک روحوں کے نمونو! ہاں مجھے اقرار ہے کہ میں گناہگار ہوں۔ میری ساری عمر گناہوں میں گزری لیکن میں نے توبہ کر لی ہے اور آپ کے قدوم میمنت لزوم سے اس لئے چمٹی ہوں کہ خدا مجھے پاک کر دے۔ مسیح کا صدقہ مجھے اپنے مبارک سایہ سے الگ نہ کیجئے۔ آپ کے سہارے زندگی کی کچھ سانسیں اس دنیا کی اور حاصل کر لوں"۔

" نہیں ہرگز نہیں! ہم سب تیری وجہ سے عذابِ الٰہی مول نہیں لے سکتے"۔

امیرِ سفر کے حکم پر بڑھیا اس کے پاؤں سے لپٹ کر دہائی دینے لگی۔ مقدس باپ مجھے پورا الیقین ہے کہ میں زندہ وسلامت واپس نہیں آسکتی اور نہ مجھ میں یہ جرأت ہے کہ آپ کے حکم کو ٹال کر آخری اور سب سے بڑے گناہ کا ارتکاب کر سکوں میں آپ کا حکم بجا لاؤں گی۔ میری وصیت سن لیجئے میں نے توبہ کے بعد سوت کات کر کچھ رقم بچائی ہے۔ اس رقم کو مراقش پہنچ کر اجتماع عام میں خیرات کرنا چاہتی تھی۔ آپ میری رقم قبول فرمائیں۔

اور یہ کہہ کر بڑھیا نے چند سکے مقدس باپ کے قدموں میں ڈال دئیے پھر وہ نہایت سکون سے اُٹھی اور فضا کی تاریکی میں جذب ہو گئی۔ بجلیوں کی چمک اور کڑک میں دس گنا اضافہ ہو گیا زمین پھر ہی اور آسمان و زمین ایک ساتھ متزلزل ہو گئے۔ دھماکے شدید سے شدید تر ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان جہنمی گولے زمین کی طرف پھینک رہا ہے۔ بجلی کی

ایک کوند میں سب نے دیکھا کہ بڑھیا نے بھی اپنا طواف پورا کر لیا تھا پھر تاریکی میں اس کا سایہ کنوئیں کی طرف بڑھتا نظر آیا جیسے ہی بڑھیا نے کنوئیں کو چھوا۔ آسمان کے سینے میں بجلیوں کا طوفان چمک اٹھا۔ اتنی کرخت آواز سے بادل گرجا کہ ساری زمین ہل گئی۔ سب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ "اف گناہگار عورت" سب کی زبان سے نکلا۔ بجلی تیزی سے چمکی اور تڑپی اور لہرائی۔ بڑھیا نے اپنا سر کنوئیں کی من پر رکھ دیا۔ "اے آسمانوں کے مالک ایک حقیر جان قبول کر لے اور اپنے پیارے بندوں کو خوف اور سراسیمگی سے بچا لے ——!"

ایک زبردست کوند پھر ہوئی۔ اس کوند میں ساری کائنات روشن ہو گئی اور پھر آسمان پر بجلی کی ایک لمبی سی لہر چمک کر زمین کی طرف چلی۔ ساتھ ہی ہزاروں کڑکوں سے زیادہ بھیانک ایک کڑک ہوئی۔ ایک تیز شعلہ سا اٹھا بجلی اپنی مکمل آب و تاب اور غضبناکی کے ساتھ بڑھیا کے سر پر چمکی۔ بڑھیا لڑکھڑا کر گری اور ساتھ ہی معبد سے ایک دردناک چیخ اٹھی بجلی گر کر زمین میں سما گئی۔

دیکھتے دیکھتے بادل چھنٹ گئے۔ پانی برسنا بند ہو گیا۔ فضا تاریکی سے پاک ہو چکی تھی آسمان پر ڈھلی ہوئی چاندنی دوڑ گئی۔ چاند چمکنے لگا۔ اور۔ اور۔ اور —— یہ کیا ہے بڑھیا ہوش میں آ گئی۔ وہ اٹھی اور معبد کی طرف واپس ہونے لگی۔ مگر اس کی چیخ نکلی "او خدا! وہ معبد کہاں گیا۔ وہ مقدس بندے کہاں چلے گئے۔ اف میرے خدا! معبد کی جگہ یہ بھیانک غار" وہ پھر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔"

صبح کو جب بڑھیا ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ مراقش کے لوگ اُسے گھیرے ہوئے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ تو کون ہے؟ کیا تو نے چالیس مقدس انسانوں کے قافلے کو کہیں دیکھا ہے؟ وہ عنقریب ہم سے ملنے والے تھے۔

بڑھیا ہر کّا برکّا سب کے چہرے تک رہی تھی۔ وہ بول نہ سکی۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا مطلب یہ تھا کہ "یہاں ایک معبد تھا سب اس میں پناہ گزیں تھے معلوم نہیں معبد کے ساتھ وہ سب کہاں چلے گئے۔ کیا تم بتا سکتے ہو؟"

کہتے ہیں کہ اسی دن اجتماعِ عام میں ایک مقرر نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"وہ چالیسوں مردِ بے عمل اور ریاکار تھے خدا نے اس عورت کی وجہ سے انھیں تا دیر محفوظ رکھا۔ پھر جب انھوں نے عورت کو الگ کیا۔ خدا کا غضب ان پر ٹوٹ پڑا۔ لوگو! مرد جب عورت کو زمین پر تنہا چھوڑ دے گا اور اس کی حفاظت نہ کرے گا تو وہ آسمانی عذاب کا شکار ہو جائے گا۔

اندیشوں کے گرفتار

مسیتا سائیں تکیہ کرامت شاہ میں عشاء کے وقت تک رہتا تھا۔ عشاء کے
بعد وہ اپنے گاؤں چلا جاتا اور پھر صبح کی نماز تکیہ کی مسجد میں آکر پڑھتا تھا جب تک وہ
تکیہ کے احاطہ میں رہتا، مختلف قسم کے اوراد و وظائف میں مصروف رہتا جو ارادتمند
کرامت شاہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے آتے مسیتا سائیں سے ضرور ملتے۔ مسیتا سائیں
ان کو بزرگانِ دین کی کرامتیں تمثیلوں اور کہانیوں کے انداز میں سنایا کرتا اور پھر جب
عشاء کے بعد گھر جاتا تو اپنی بیوی کو بھی سناتا۔ عورتوں میں دینی رجحانات ہوتے ہی
ہیں۔ مسیتا کی بیوی بڑے شوق سے سنتی، یاد رکھتی اور جب صبح کو مسیتا اپنے تکیے پر
چلا جاتا تو وہ دوسری عورتوں کو وہی تمثیلیں اور کہانیاں سناتی۔ عورتیں ان کہانیوں
سے بڑی نصیحت حاصل کرتیں اور جہاں تک ان سے ہوتا بزرگانِ دین کی پیروی کرنے کی کوشش
کرتیں مسیتا سائیں کی بیوی فاطمہ کا کہنا تھا کہ ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو سننے کا مطلب صرف
یہ نہیں کہ ان سے مزہ لیا جائے بلکہ جو کچھ سنا جائے اس سے اپنی زندگی سنواری جائے
اس کا حافظہ بھی اچھا تھا۔ مسیتا سائیں تو اپنی کہی کہانیاں اور واقعات بھول جاتا یا بھول

نہ جاتا تو روزمرّہ کی مصروفیتوں میں نظر انداز کر دیتا لیکن فاطمہ چونکہ ایک عملی عورت تھی۔ وہ اپنے شوہر سے زیادہ ان سے فائدہ اُٹھاتی اور اس بات نے اس کے کردار کو بہت زیادہ نکھار دیا تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ مسیتا سائیں عشاء کے بعد تکیہ کرامت شاہ سے اپنے گاؤں جا رہا تھا وہ کوئی وظیفہ پڑھتا ہوا جلدی جلدی اپنے قدم بڑھا رہا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی وہ رک کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ کراہنے کی آواز کدھر سے اور کہاں سے آ رہی ہے چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اسے معلوم کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ داہنی طرف بڑھا اس نے ایک کھڈ میں جھک کر دیکھا۔ کراہنے کی آواز اسی گڈھے سے آ رہی تھی اس نے دیکھا ایک کڑیل جوان کھڈ کے اندر زخمی حالت میں پڑا ہے اور اس کے نیچے ایک مُردہ گھوڑا بھی۔ مسیتا سائیں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وہ سمجھ گیا تیر اور ترکش والا یہ جوان ضرور کوئی شکاری ہے جو اچانک اس کھڈ میں آ گرا۔ اس کا گھوڑا اس اچانک حادثے سے مر گیا۔ لیکن وہ خود ابھی زندہ ہے۔ مسیتا سائیں اس زخمی جوان شکاری کی جان بچانے کی تدبیر سوچنے لگا۔ آس پاس راستہ اور میدان سنسان تھا۔ مدد ملنے کی کہیں سے کوئی امید نہ تھی۔ وہ تن تنہا کھڈ میں اُتر گیا۔ اس نے پوری قوت لگا کر اللّٰہُ اللّٰہُ کا نعرہ لگایا اور جوان شکاری کو پیٹھ پر لاد کر اوپر لے آیا۔ جوان شکاری بے ہوش تھا۔ مسیتا کو پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ بے ہوش آدمی کا بدن ہوشیار آدمی کے بدن کے مقابلے میں کئی گنا

بھاری ہوتا ہے۔ اس نے اسے کھڈ کے کنارے گھاس پر لٹا دیا اور پھر سوچنے لگا کہ اُسے گھر تک کیسے لے جایا جائے۔ اس نے ایک نظر پھر راستے اور سنسان میدان پر ڈالی اب بھی اللہ کے سوا کوئی مددگار دکھائی نہ دیا۔ اس نے ہمت سے کام لیا۔ زخمی جوان کو پھر پیٹھ پر لادا اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں فاطمہ شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ مسیتا کو آنے میں دیر ہوئی تو وہ فکرمند ہونے لگی۔ وہ بار بار اپنے کچے گھر کے دروازے پر آکر دیکھتی، جھانک کر دور تک راستہ پر نظر ڈالتی اور پھر جب اس کا منّا سوتے سوتے منمناتا تو واپس کوٹھری میں چلی جاتی۔ ایک بار جب وہ دروازے پر آئی تو دیکھا کہ شوہر کسی کو لادے ہوئے چلا آرہا ہے۔ لاش کے بوجھ سے وہ دبا جا رہا ہے بار بار سنبھالتا ہے لیکن چونکہ خود جوان ہے اور ہمت بھی جوان اور زبان پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا وظیفہ ہے وہ اسی بل بوتے پر آ بھی رہا تھا۔ فاطمہ اسے اس حال میں دیکھ کر لپکی "تم یہ کسے لادے ہوئے ہو؟" اس نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولی " اچھا اسی جگہ ٹھہرو میں چارپائی لے آؤں"۔

مسیتا سائیں بے حد تھک چکا تھا۔ اب تک وہ اپنے بل بوتے اور حوصلے کے سہارے لاش کو لادے ہوئے آرہا تھا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے سہارے اپنی ہمت کو تقویت دے رہا تھا۔ بیوی کا سہارا ملا تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کی طاقت نے جواب دے دیا۔ اس نے زخمی جوان کو زمین پر لٹا دیا۔ اور کھڑا ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اب اسے خیال آیا کہ اپنی لاٹھی وہ کھڈ کے پاس ہی بھول آیا۔ "اونھ کل مل جائے گی"۔ اس نے کہا۔

اتنی دیر میں فاطمہ چار پائی لے آئی۔ اس نے شوہر کو پسینے پسینے دیکھا اپنی اوڑھنی سے اس کے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔"کون ہے یہ؟"

"دیکھتی نہیں، اللہ کا ایک بندہ ہے۔ اور بے چارہ موت کے منہ میں۔"

"ہے ہے بے چارہ!" فاطمہ نے پھر کچھ نہ پوچھا۔ دونوں نے مل کر زخمی جوان کو چار پائی پر ڈالا اور گھر کے اندر اُٹھا لائے۔ چار پائی پر شاید زخمی کو کچھ آرام ملا تو اس نے حرکت کی اور پھر اس کی زبان سے نکلا۔" پانی ـــ پا ـــ نی" سیتا پانی لینے چلا تو فاطمہ نے ٹوکا "ٹھہرو۔ چلو سے دینا، ایک دم پیالہ منہ سے نہ لگا دینا۔ ایک دو چلو سے زیادہ نہ پلانا نہیں تو مر جائے گا۔" اور یہ کہہ کر وہ دودھ گرم کرنے لگی۔

سیتا نے ایک چلو پانی زخمی کے منہ میں ٹپکایا۔ زخمی غیر ارادی طور پر پی گیا۔ اس کے ہونٹ تر ہو گئے زبان بھیگی تو پھر اس نے کہا " پانی !" سیتا نے ایک چلو پانی اور پلایا۔ ادھر فاطمہ نے پکارا۔ بس بس۔ اب میں دودھ لاتی ہوں۔"

سیتا سمجھا تھا کہ زخمی ہوش میں آرہا ہے۔ پوچھنے لگا" بھائی! کون ہو تم؟ خدا کرے تم جلد اچھے ہو جاؤ۔ تمہارا گھوڑا مر چکا ہے۔ اسی لئے میں تم کو گھر لے آیا۔ میں ابھی تمہاری مرہم پٹی کرتا ہوں تم پرسوں اپنے گھر چلے جانا۔"

زخمی جوان نے جواب نہ دیا۔ فاطمہ گرم دودھ لے آئی تھی۔ اس نے چمچے سے گرم دودھ پلایا۔ کبھی ایک چمچہ دودھ زخمی کے حلق سے اُتر جاتا اور کبھی منہ سے گر جاتا۔ وہ زیادہ نہ پی سکا۔ شاید وہ کسی قدر ہوش میں آنے کے بعد پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔

گھر میں نہ جانے کب کا پرانا مرہم رکھا تھا۔ فاطمہ وہی لے آئی۔ زخموں کو صاف کر کے وہی مرہم لگا دیا گیا اور زخمی کو آرام کرنے کے لئے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

"ہے ہے، غریب نہ جانے کیسے کھڈ میں گر گیا ؟" فاطمہ نے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"

"نہ جانے کی کیا بات ہے۔ شکاری لوگ بے تحاشا شکار کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ کچھ دیکھتے تو ہیں نہیں۔ بس اسی لئے یہ حادثہ ہو گیا۔ گھوڑا اس میں گرا۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں چور چور ہو گئیں اور شکاری چوٹ کھا کر بے ہوش ہو گیا۔"

"دیکھو تو بے چارے کا کتنا خون نکل گیا۔ سارے کپڑے خون سے لت پت ہیں۔"

اور یہ کہتے کہتے فاطمہ نے اُسے چادر اوڑھا دی اور پھر نہ جانے وہ کیوں چونک سی پڑی۔ گھر کے چراغ کی مدھم روشنی زخمی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ فاطمہ بڑے غور سے اس کا چہرہ تکنے لگی پھر وہ مڑ کر شوہر کے پاس آئی جسے اس نے کھانا دے دیا تھا۔ سیتا کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔

"ارے تیرا چہرہ فق کیوں ہو رہا ہے ری !" اس نے بیوی کو ڈرا ہوا محسوس کیا۔"

"تم نہ جانو نہ پہچانو ! میں کہتی ہوں۔ تم یہ کیسے گھر میں لے آئے" فاطمہ نے چپکے سے کہا۔ اس کے اس طرح کہنے سے سیتا گھبرا سا گیا۔ اس نے پیالہ اُٹھایا۔ پانی پیا۔ پھر

پوچھنے لگا "کیا تم اسے پہچانتی ہو ؟"

"پہچانتی تو نہیں اس کے یہ تیر، اس کی یہ کمان، اس کا یہ ترکش! ان سے پہچانو، یہ کون ہے ؟"

"میں تو یہی سمجھا تھا کہ اللہ کا ایک بندہ ہے۔ زخمی ہے، مدد کا محتاج ہے۔ اس کی مدد کرنا چاہیئے۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ملتانہ ڈاکو ہے تم نے سنا نہیں۔ اس کی گرفتاری کے لئے پانچ ہزار کا انعام ہے اور یہ بھی تو اگر کوئی اسے اپنے گھر چھپائے گا تو وہ بھی اسی کے گروہ کا سمجھا جائے گا۔"

"بیوی سے یہ سنا تو مستیا سائیں کی ساری ہمدردی غائب ہو گئی۔ اس نے کہا "تو ابھی ہوا ہی کیا ہے۔ آؤ چلیں۔ اسے تالاب کے کنارے ڈال آئیں۔"

"نہ اب نہیں۔ اب تو تم اُسے پناہ دے چکے۔ تم کو وہ قصّہ یاد نہیں جو اس جمعہ کو چھوڑ اس جمعہ کو سنایا تھا۔"

"کیا۔"

"وہی کہ ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے اپنے بیٹے کے قاتل کو پناہ دی تھی۔ وہ جانتے نہ تھے کہ یہی ان کے بیٹے کا قاتل ہے۔ پھر معلوم ہوا تو صبح ہونے سے پہلے اُسے گھوڑا دیا۔ زادِراہ دیا۔ اور کہا "جلدی یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ بیٹے کے غم میں میں تم کو قتل کر دوں۔

"ہاں، یہ واقعہ تو سچا ہے۔"

"تو پھر ہم بھی اسے پوری پناہ دیں گے۔"

"اور کل ہی چوکیدار راجہ صاحب کو خبر کرے گا۔ اور پھر تم جانتی ہی ہو کیا ہوگا۔"

"تم کہہ دینا کہ میں کیا جانوں، کون ہے۔ تم تو بس کہہ دینا کہ یہ اللہ کا بندہ ہے۔"

"اور سُن تو منّے کی ماں۔"

"کیا کہتے ہو۔ چپکے چپکے باتیں کرو۔ کوئی سن نہ لے۔"

"منّا سو رہا ہے نا!"

"اوئی! یہ کیا بات ہوئی، تم کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔"

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم غریب ہیں۔"

"وہ تو ہیں ہی، اللہ کا شکر ہے۔"

"تو کیوں نہ یہ کریں کہ .... کہ .... کہ .... !"

"کیا۔ کہو؟"

"کل راجہ سے کہہ کر اسے پکڑوا کیوں نہ دوں، پانچ ہزار کا انعام لے لوں۔"

"ہائے اللہ! توبہ کرو منّے کے ابا تم نے حاتم طائی کا قصہ سنلیا تھا۔ کسی دشمن نے حاتم طائی کے قبیلے پر حملہ کر دیا مگر حاتم اس لئے نہیں لڑا کہ بیکار میں خون خرابہ ہوگا۔ وہ جنگل کی طرف چلا گیا۔ دشمن نے دس ہزار اشرفیوں کے انعام کا اعلان کیا جو حاتم کو گرفتار کرلائے اس کو ملے گا یہی باتیں لکڑہارا جنگل میں اپنی بیوی سے کر رہا تھا کہ حاتم مل جائے تو پکڑ کر

لے جاؤں۔ حاتم سن کر آ گیا۔ اور کہا "چل بھائی مجھے گرفتار کر کے لے چل اور انعام لے۔ یاد ہے نہ یہ قصہ۔!"

"یاد تو ہے۔ تیری کیا رائے ہے۔"

"میں تو سمجھتی ہوں تم ہمدردی کے طور پر بھولے سے اسے لے آئے۔ اب اس کی خدمت کرو۔ میں کل پرسوں تک کسی کو گھر میں آنے ہی نہ دوں گی۔ پرسوں تک یہ خود اچھا ہو جائے گا پھر اسے کچھ کہے بغیر رخصت کر دیں گے اور اپنے اللہ سے معافی مانگیں گے۔"

تو بڑی ایماندار بیوی ہے۔ تو تجھے پانچ ہزار نہیں چاہئیں۔"

"نہ، مجھے اللہ کی خوشی چاہیئے۔ بس!"

"میں تو تیرے لئے ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے لالچ نہیں۔"

فاطمہ نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا۔ مسیتا کھانا کھا چکا تھا۔ فاطمہ نے اس پر بات ماری۔ "تم مرد بڑے ایرپھیر سے باتیں کرتے ہو۔ دل میں کچھ زبان پر کچھ، ہم عورتیں ایسی نہیں ہوتیں۔ ہمارے جو دل میں وہ زبان پر۔"

"تو تو اپنے کو رابعہ بصری سمجھتی ہے۔" اور یہ کہہ کر مسیتا اپنی چارپائی کی طرف بڑھا، جا کر لیٹ رہا۔ اور لیٹتے ہی سو گیا۔ فاطمہ نے برتن بڑھائے۔ اس نے ایک نظر زخمی جوان پر پھیر ڈالی۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ "اللہ تو ہی مالک اور مولا ہے۔" اس کی زبان سے نکلا اور وہ اپنی کھٹیا پر جا کر لیٹ گئی۔ منّے کو سینے سے لگا لیا اور سو گئی۔

صبح سویرے مسیتا سو کر اُٹھا تو وہ ہکّا بکّا ہو کر رہ گیا۔ اس نے گھر میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بیوی کو جگایا۔

"کیا ہے کیا؟ بیوی نے کروٹ لینے کے ساتھ ہی کہا۔"

"ملتانہ بھاگ گیا۔"

فاطمہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور حیرت کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی "اور میری چادر بھی لے گیا۔"

" دیکھتی کیا ہے۔ وہ کوئی سوئی تھا جو نظر نہ آتا۔" مسیتا نے کہا "چلو اچھا ہی ہوا، وہ خود چلا گیا۔ اب ہم سے کیا غرض۔"

اور یہ کہہ کر اس نے اسی میں خیریت سمجھی کہ جلد سے جلد اپنے تکئے کی طرف چل دے، اس نے بیوی کو تاکید کر دی کہ اگر کوئی کچھ پوچھے تو کچھ نہ بتائے۔

مسیتا سائیں اپنے تکئے پر چلا گیا لیکن وہ پریشان سا رہا۔ دوپہر کے قریب اس نے دیکھا کہ چار تلنگے اسی طرف آ رہے ہیں۔ اب تو وہ گھبرایا سمجھ گیا کہ راجہ کو خبر ہو گئی۔ نہ جانے فاطمہ پر کیا گزری وہ لپک کر مزار کے آس پاس جھاڑو دینے لگا اور کوئی وظیفہ پڑھنے لگا۔

سپاہی تکیہ میں آئے اور پوچھنے لگے "مسیتا سائیں تم ہو۔؟"

مسیتا سائیں کی زبان لڑکھڑا گئی۔ کہنے کو تو اس کی زبان سے "نہ" نکل گیا لیکن دل میں کھد بد ہونے لگی کہ فاطمہ کو پکڑا ہو تو ـــــ؟"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" ایک سپاہی نے پوچھا۔"

"یہیں کہیں ہوگا۔ کیا بات ہے ؟" اس نے سپاہیوں سے پوچھا۔ وہ ہکلا بھی گیا، ساتھ ہی اسے محسوس ہوا کہ جیسے پیاس کے مارے حلق میں خشکی آجاتی ہے بالکل وہی حال اس کا ہے۔ سپاہیوں نے بتایا کہ بات وات ہم نہیں جانتے۔ ہم کو حکم ملا کہ مسیتا سائیں کو حاضر کرو۔"

" تم نے اسے اس کے گھر کیوں نہیں دیکھا" مسیتا سائیں نے پوچھا۔ جواب میں سپاہیوں نے بتایا کہ راجہ صاحب نے اس کی بیوی کو بلایا ہے اب مسیتا کے لئے بھی حکم ہوا ہے۔

یہ سُن کر مسیتا آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ پاس آکر بولا میں ہی مسیتا سائیں ! ہوں مجھے گرفتار کر لو۔"

" ہمیں گرفتار کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ حکم ہے کہ مسیتا کو حاضر کرو۔ تو تم ہمارے ساتھ چلو۔"

مسیتا نے اپنا سامان سنبھالا۔ لاٹھی لی اور سپاہیوں کے آگے آگے چلنے لگا۔ راستے میں نہ معلوم بے چارے کو کیسے کیسے اندیشے آرہے تھے وہ "یا اللہ یا رحمٰن" کا وظیفہ پڑھتا جارہا تھا۔ سپاہیوں نے گڑھی کے اندر پہونچ کر اسے اندر کردیا اور پھر دو خاص سپاہیوں نے لے جاکر اسے راجہ کے سامنے پیش کردیا۔ مسیتا نے جھک کر راجہ کو سلام کیا اور ساتھ ہی اس کی زبان سے نکلا" سرکار ! میں بے خطا ہوں مجھے معلوم نہ تھا۔"

" ہوں۔ں۔ں، راجہ نے بڑھا کر کہا" رات کو تم نے ملتانہ کو اپنے گھر میں پناہ دی اور اب کہتے ہو کہ تم بے خطا ہو۔ کیا تم نے ہمارا اعلان نہیں سنا !"

راجہ نے ڈانٹ کر یہ کہا تو مسیتا کو ایسا لگا کہ اس کے پاؤں کی طاقت جاتی رہی۔
اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا "سرکار! میں ملتانہ کو نہیں جانتا ...."
"اچھا تو تم اس کی سزا بھگتو۔"
" اور سرکار میری بیوی؟"
" تم دونوں کو سزا دی جائے گی۔ تمہاری بیوی حوالات بھیج دی گئی۔"
مسیتا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، راجہ نے اس کے رونے کی پروا نہیں کی، وہ مڑا۔
اور محل میں چلا گیا۔ چلتے وقت دونوں سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس اپرادھی کو پہلے رانی کی سیوا میں بھیجو۔ وہ بھی اس نڈر اپرادھی کو دیکھنا چاہتی ہیں جس نے ملتانہ کو اپنے گھر میں پناہ دی۔
مسیتا کو بالکل یقین ہو گیا کہ اب موت قریب ہے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے کو کوسنے لگا۔ "سچ ہی کہا ہے سمجھدار لوگوں نے کہ بیوی کے کہنے میں کبھی نہیں آنا چاہئے۔ کاش کہ میں ملتانہ کو گھر میں نہ لاتا۔ لایا تھا تو پھر تالاب کے کنارے ڈال آتا۔ یا راجہ کو خبر کر دیتا۔ انعام کا انعام پاتا اور جان بھی بچتی........"
دونوں سپاہی اس کے آس پاس چل رہے تھے اور دونوں کے مضبوط ہاتھوں میں اس کی دونوں باہیں تھیں۔
" میں بھاگوں گا نہیں۔ میں چور نہیں ہوں، میری بیوی اور میرا بچہ حوالات میں ہے تو میں بھاگ کر کیا کروں گا۔" مسیتا نے سپاہیوں سے کہا۔ ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ اُسے ہتکڑی اور بیڑی کیوں نہیں پہنائی گئی۔

وہ محل کے دروازے تک لے جایا گیا۔ دروازے پر سپاہی رُک گئے۔ اُسے اندر کر دیا۔ اب وہ محل کے سپاہیوں کے بیچ میں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کانپتا اور لرزتا ایک بڑے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ کمرے کے دروازوں پر ہرے ہرے پردے پڑے تھے اور ان پر رام اور سیتا کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ سپاہیوں نے ایک دروازے کا پردہ اُٹھایا۔ اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

اندر پہونچتے ہی اس کا دماغ ماؤف سا ہو کر رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ رانی صاحبہ ایک چھوٹے سے مرصع تخت پر براجمان ہیں۔ لونڈیاں، باندیاں ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ فاطمہ بچے کو لئے ایک چارپائی کے پاس اُداس بیٹھی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس نے بھی ایک نظر مسیتا کو دیکھا۔ لیکن اسے حکم نہ تھا کہ اپنی جگہ سے ہل سکے یا زبان سے بول سکے۔ مسیتا نے دیکھا چارپائی پر کوئی فاطمہ کی چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ مسیتا سمجھ گیا کہ چادر سمیت ملتانہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہوگا۔ وہ موت کے لئے تیار ہو گیا اس نے بیوی کی طرف دیکھ کر انگلی اوپر اُٹھائی گویا اس نے کہا کہ اب خدا کے سوا کوئی بچا نہیں سکتا وہ موت کے لئے تیار ہو گیا تو اس کا دل بھی ٹھہرا، اب اس نے جھک کر رانی کو سلام کیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"سرکار! میں ملتانہ کو پہچانتا نہ تھا۔"

"اچھا تو اب پہچان!" اور یہ کہہ کر رانی صاحبہ نے فاطمہ کو حکم دیا کہ اپنی چادر اُتار لے۔

"مولا جو تیری مرضی" کہہ کر فاطمہ نے چادر اُتاری اور ساتھ ہی اس کی زبان سے نکلا "سرکار!" وہ مسیتا کی طرف دیکھنے لگی۔ مسیتا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اس نے ایسا ڈرامہ کاہے کو کبھی دیکھا تھا

اس نے دیکھا کہ راجہ صاحب مسکراتے ہوئے چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے پاس وہی ترکش رکھا ہوا تھا اور انہی کپڑوں میں تھے جو زخمی جوان کے پاس رات کو فاطمہ اور مسیتا نے دیکھے تھے۔ فاطمہ اور مسیتا دونوں سلام کے لئے جھک گئے۔

ادھر رانی نے ایک باندی سے کہا "اس کے بچّے کو اُٹھالا اور میری گود میں دے دے"

حُسنِ سیرت

"اوئی، دولھا بھائی کالے ——!" ننھی سعیدہ مصلحت وصلحت کیا جانے وہ باہر سے آئی اور اس نے گولہ سا داغ دیا۔ ماں نے بڑھ کر اُسے چپ تو کر دیا لیکن آواز عورتوں کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ سب کی نظریں پروین کی طرف اُٹھ گئیں۔ پروین ؟ وہ جو ابھی ابھی پروین سراج بن چکی تھی پروین وہ جو اپنے گورے چٹے روپ رنگ میں ہر وقت دودھ سے نہائی معلوم ہوتی تھی۔ پروین وہ جو اپنے حسن وجمال میں ستاروں کو شرماتی تھی۔ عورتوں کو یقین نہیں آیا کہ اس کا دولھا کالا ہو سکتا ہے۔ سرگوشیاں ہونے لگیں کہ سعیدہ کو دھوکہ ہوا۔ بعض عورتیں چپکے چپکے یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ میں ایسا ہی ہوتا ہے، اور بعض کا ہمدردانہ لہجہ یوں بھی تھا۔ "پھر آخر پروین کے لئے کیا دولھا آسمان سے آئے۔ آج کل اچھے بَر ملتے ہی کب ہیں۔ شکل وصورت کے ہیں تو بے روزگار۔ بڑے گھرانے کے ہیں تو بے کردار، آوارہ و بدمعاش، پڑھے لکھے ہیں تو ٹکے کے نوکر بے گھر بے در اور اگر نیک سیرت ہیں تو خوبصورت نہیں، آخر ماں بے چاری کیا کرتی جوان جہانہ کو بٹھا کر

بڑھیا کر دیتی۔ یوں بھی تو پچیس سے اوپر ہو گئی غریب!

یہ تو تھیں مہمان خواتین کی چہ می گوئیاں۔ اس غریب پروین نے بھی بہن کی معصوم آواز سن لی تھی۔ اچانک وہ چونکی اس نے سعیدہ کی طرف دیکھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ساری خواتین کی نظروں کے تیر اسی کی طرف ہیں تو وہ ان تیروں کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے سر جھکا لیا اور ایک خلفشار میں مبتلا ہو گئی۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار وہ ایک ایسی ہی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ وہاں اس کی سہیلی ثریّا نے چھت سے براتیوں کی طرف انگلی اُٹھائی تھی اور بتایا تھا میرے لئے اس کا پیام آیا تھا۔ بھلا میں اس کالے کلوٹے سے اپنا پلّو کیوں باندھنے لگی۔ میں نے صاف کہہ دیا امی جان سے کہ چودھویں کا چاند اس کالے نمک کے پہاڑ پر نہیں چمکے گا۔

پروین نے پوچھا تھا کہ اس کا نام کیا ہے تو ثریّا نے سراج احمد ہی بتایا تھا غریب سوچنے لگی، کیا وہی سراج اس کا سرتاج بن گیا۔ اگر وہی ہوا تو — ہ اس کی زبان سے نکل گیا اس کے آس پاس اس کی ہمجولنیں بیٹھی چہلیں کر رہی تھیں۔ سعیدہ کی آواز سے ان کی چہلوں پر اوس پڑ گئی۔ ایک سنجیدہ لڑکی نے، شاید اس کا بیاہ ہو چکا تھا۔ ہاں اسی سنجیدہ نے کہا بھی" اونہہ سندرتا لے کر کیا بازار میں بیچنا ہے۔ صورت کو کوئی دو دن چاٹ لے۔ آدمی کی سیرت اچھی ہونی چاہیئے"۔ لیکن اس کی سنجیدہ بات پروین کے کانوں میں گرم سیسہ بن کر لگی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا کہ اچھا ہوا آج ثریا اس تقریب میں نہ آسکی وہ ہوتی تو سراج کو دروازے کی جھرّیوں سے، کواڑوں کی درازوں سے چھت کی منڈیروں سے

غرض کسی نہ کسی طرح ضرور دیکھتی اور پھر وہ کیا کہتی۔ مگر اس کے نہ ہونے سے کیا اصلیت اس سے چھپ جائے گی۔ آج نہیں تو کل وہ بھی جانے لگی۔ اور جب جانے لگی تو بات مارے گی، اری اندھی کیا تو نے دیکھا نہیں تھا اور پھر بھی اسے قبول لیا۔ ریشم میں کمبل کا پیوند لگا لیا۔ مگر اس بے چاری کو کیا معلوم کہ ہفتہ بھر کے اندر ہی یہ سب طے ہو گیا۔ کس نے کس کو دیکھا، بس اماں ابا میں کچھ کھس پھس ہوئی اور باتوں باتوں میں ایک دن مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ اورنٹیل کالج میں ٹیچر ہے۔ ساڑھے تین سو تنخواہ ہے تندرست و توانا اور شریف آدمی ہے۔ میں بھی مطمئن ہو گئی کہ چلو ابا جان میرے دشمن تو ہیں نہیں اُف اللہ"۔ اس کی زبان سے نکل گیا ـــــ لڑکیاں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ کچھ بے تکلف اس سے دریافت حال کرنے لگیں۔ مگر اس نے ٹال دیا اور پھر سوچنے لگی۔ کاش کہ سعیدہ اس بھرے مجمع میں نہ کہتی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دولھا بلایا ہی جائے گا۔ اور کچھ رسومات کے ادا کرنے کے بعد وہ مجھے ڈولے میں بٹھا کر چلتا بنے گا۔ تب تو سب دیکھیں گے ہی۔

ہوا بھی یہی ویسے چاہے مہمان عورتیں کچھ دیر بعد تقاضہ کرتیں لیکن جب سعیدہ سے دولھا کی تعریف سنی تو انھیں دولھا کو دیکھنے کے لئے بے چینی ہونے لگی۔ انھوں نے بلانے کا تقاضہ شروع کر دیا قریب قریب ساری عورتیں دلچسپی لینے لگیں۔ ادھر نوشہ کو اندر بلانے کا اہتمام شروع ہوا ادھر پروین کو وحشت ہونے لگی۔ اس کا بس چلتا تو وہ منع کر دیتی کہ مت بلائیں، لیکن وہ کیسے کہہ سکتی تھی۔ ہاں وہ یہ ضرور کر سکتی تھی اور اس نے کیا بھی

کہ اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور پھر دیکھتے دیکھتے اس پر دورہ پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ پیر اینٹھنے لگے۔ منہ سے کف جاری ہو گیا اور وہ بے حال ہو گئی گھر کی بڑی بوڑھیاں دوڑ پڑیں۔ لڑکیوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا اور تجربہ کار عورتیں نئی نویلی دلہن کو سنبھالنے میں لگ گئیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کامیاب ہوئیں۔ پروین کو ہوش آیا تو اس نے ماں کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ماں، ایسا نہیں کہ کچھ سمجھتی نہ ہو، وہ سب جانتی تھی۔ اس نے جواب میں اپنا سر بیٹی کے پیروں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد اب یہ کہنا بیکار ہے کہ پروین کس دل کے ساتھ رخصت ہو کر سراج کے ساتھ گئی۔

پروین کا دولھا سراج ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ پیشہ اس نے اپنی طبیعت کی مناسبت سے اختیار کیا تھا۔ اسے درس و تدریس سے بڑا شغف رہتا تھا۔ اس کام سے اسے قدرتاً دلچسپی تھی۔ بہت سے غریب لڑکے مفت اس کے گھر پر پڑھنے آتے تھے۔ اور وہ ہر روز باقاعدہ ان پر ایک گھنٹہ صرف کرتا تھا۔ کتابی تعلیم کے ساتھ کسی نہ کسی مسئلے کو بہانہ بنا کر وہ بچوں کی ذہنی تربیت ضرور کرتا۔ وہ محلے میں بڑا ہر دل عزیز تھا۔ چھوٹے بڑے سب اس کے کردار اور اس کی شرافت و سعادت مندی کی تعریف کرتے تھے۔ اپنے کردار اور گفتار میں وہ ایک شریف انسان نظر آتا تھا۔ لیکن وہ اس کو کیا کرتا کہ قدرت نے اُسے رنگ کا کالا بنایا تھا۔ اسے اپنے کالے رنگ پر اپنے پیدا کرنے والے سے شکایت بھی نہ تھی ایک بار جب اس کے بے تکلف دوستوں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے اس کے رنگ پر

تنقید کی تو ہنس کر بولا، بھائی آخر کوئی نہ کوئی عیب ہونا ہی چاہیئے۔ بے عیب خدا کی ذات ہے۔ ویسے میں تو اس رنگ کو عیب نہیں سمجھتا۔

سراج بہت خوش تھا جب اس نے سنا کہ والدین نے اس کی شادی ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے ٹھہرائی ہے۔ اس نے یہ بھی سنا کہ لڑکی چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہے اس نے ادھر تو توجہ نہیں دی۔ لیکن تعلیم کے متعلق دو چار سوالات اپنی بہن سے کئے، اور خاموش ہو کر اپنی رائے دے دی۔ اور پھر ایک دن بڑے ارمانوں کے ساتھ اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔ وہ اپنی بیوی کو دیکھنے کے لئے بڑا بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے نہ جانے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ اس نے نہ جانے کیا کیا سوچا تھا۔ اس نے پہلی ملاقات کی اوّلین گفتگو کا موضوع بھی سوچ لیا تھا۔ لیکن اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی جب وہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوا اور اس نے نئی نویلی دلہن کو ہاروں، گجروں اور سرخ چادر کے بغیر مسہری کے پاس پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ وہ کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ وہ سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر جواب کا انتظار کرنے لگا اس نے کمرے کا جائزہ لیا ایک طرف ہار اور گجرے اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے کسی نے غصّے میں نوچ کر انھیں پھینک دیا ہو۔

"سنا تھا آپ پر دورہ پڑا تھا، کیا ابھی کچھ اثر باقی ہے؟" اس نے پھر استفسار کیا اور پھر برجستہ اس کی زبان سے دعائیہ کلمات نکل گئے۔

" اللہ تعالیٰ آپ کو میرے گھر میں ہمیشہ خوش و خرم رکھے اور مجھے توفیق عطا فرمائے کہ میں آپ کو خوش رکھ سکوں اور آپ کے وہ سارے حقوق ادا کر سکوں جو شرعاً مجھ پر عائد ہوتے ہیں۔"

پروین اب بھی چپ تھی۔ وہ اسے دیکھے جا رہی تھی اور وہ اس طرح سانس لے رہی تھی کہ اس کا سینہ بار بار اُبھر آتا تھا۔ سراج نے اس کیفیت کو محسوس کیا۔ اس نے پھر کہا

" اگر ضرورت ہو تو ڈاکٹر کو بلاؤں۔"

" کیوں ــــ" آخر وہ پھٹ پڑی۔" ڈاکٹر کیا میرے درد کا علاج کر دے گا، ڈاکٹر کیا آپ کے کالے رنگ کو گورا کر دے گا۔ آپ مجھے کس طرح خوش رکھ سکتے ہیں جب کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ رنگ روپ میں میرا آپ کا کوئی جوڑ نہیں۔" وہ پھر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

" پروین !"

" دیکھئے میں آپ سے عرض کرتی ہوں کہ آپ میرا نام مت لیجئے، اگر آپ اپنی عزت چاہتے ہیں تو فوراً کمرے سے نکل جائیے۔"

" بہتر ہے، میں کمرے سے نکل جاؤں گا۔ لیکن ایک بات آپ بتا دیں جب مجھ کلوٹے کو آپ نے پسند نہیں کیا تو میرے ساتھ اللہ اور رسول کا نام لے کر نکاح ہی کیوں منظور فرما لیا۔"

" مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ آپ جیسے کالے نمک کے پہاڑ پر برف کی طرح

مجھے پگھلنا پڑے گا۔"

"ماشاءاللہ! گفتگو تو آپ بڑے ترقی پسندانہ ادب میں کرتی ہیں۔ براہِ مہربانی یہ بھی فرما دیجئے کہ نکاح کے بعد وہیں یعنی اپنے والدین کے سامنے یہ مسئلہ کیوں نہ چھیڑا، کہ یہ منحوس صورت آپ کے سامنے اس وقت کیوں ہوتی ہے؟"

"ماں کی عزت کا خیال تھا۔ گھر میں سیکڑوں عورتیں تھیں۔ میں مجبور ہو گئی۔"

"تو میں بھی ایک گذارش کروں۔ میرے گھر بھی مہمان موجود ہیں۔ میں آپ کا منشاء سمجھ گیا۔ آپ اپنے دل میں گھبراہٹ محسوس نہ کریں۔ میں ابھی جاتا ہوں لیکن آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ کم سے کم کل تک صبر فرمائیں۔ کل مہمان رخصت ہو جائیں گے۔ دن گزرنے کے بعد آپ اپنے والدین کے گھر ہوں گی، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ پر کسی طرح کی زبردستی نہ ہو گی اور نہ یہ ناگفتہ بہ گفتگو کسی کے سامنے نقل کی جائے گی۔ اچھا فی امان اللہ۔ السلام علیکم۔"

سراج کرسی سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ پروین اسے دیکھتی رہی اس کے جاتے ہی اس نے کواڑ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ اس کا خیال تھا کہ سراج کے جانے کے بعد اس کی بہنیں اور بھاوجیں کمرے میں گھس آئیں گی مگر کواڑوں پر ہلکی سی دستک بھی نہ ہوئی "شاید سراج نے منع کر دیا ہو" ایک خیال اس کے دماغ میں گونجا اور وہ مسہری پر جا لیٹی اور گھنٹوں نہ جانے کیا سوچتی سوچتی نیند کی گود میں پہونچ گئی۔

واقعی دوسرے دن سراج اس کمرے کی طرف ہو کر نہیں نکلا۔ اس کے

گھر والوں نے اسے اس کی حیا پر منطبق کیا لیکن اس کے گھر والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب عشاء کے وقت اس نے ماں سے کہا کہ پروین کو اس کے ماں باپ کے گھر بھجوا دیجئے اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ گھر والوں کو حیرت تو ہوئی لیکن وہ اپنے بیٹے کے متعلق بہت خوش گمان تھے۔ اس کی خواہش پر پروین کو رخصت کر دیا۔ پروین گھر پہنچی تو وہاں بھی سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ ماں نے بیٹی کے تیور پہچان لئے تھے، مگر وہ اس وقت کچھ نہ بولی۔ تھی بھی تو عجیب بات۔ رات کو نو بجے اور سراج کے بغیر پروین پہلے چالے میں اکیلی آئی۔ سراج سمجھدار تھا کہ اس نے رات کو بھیجا۔ ورنہ دن میں زبانِ خلق کو کون روکتا۔

لیکن کیا پھر دن نہ آیا اور پھر کیا زبانِ خلق کو کسی نے روک لیا۔ دوسرے دن اہلِ محلہ کو معلوم ہو گیا۔ پروین کی سہیلیاں دوڑ پڑیں۔ کوئی شوہر کی نشانی دیکھنے کے شوق میں۔ کوئی پروین پر آوازیں کسنے۔ کوئی سسرال کے چڑھائے ہوئے زیورات دیکھنے مگر یہ سب کی سب صحن میں ہی روک لی گئیں۔ ماں نے کہہ دیا کہ پروین کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بھیڑ سے منع کیا ہے۔ مگر بُوا کو کون روکتا۔ وہ دندناتی ہوئی اپنی بھنّو کے پاس پہونچ گئی اور اسے ایک نظر دیکھتے ہی بولی۔ اوئی! یہ تو جیسی گئی تھی ویسی ہی واپس آئی۔ دراصل یہ بہت بڑی چوٹ تھی جو بُوا نے کی تھی۔ پروین سُن کر غصّے سے بے تاب ہو گئی اس نے بُوا کو ڈپٹ دیا۔" ایسے ہی آ گئی تم سے کیا ؟"

" اوئی مجھ سے کیا۔ اری نازو میں نے تجھے گود وں کھلایا ہے۔ میرا حق ہے۔

مجھے یوں جواب نہ دے۔ میاں چاند تارا ہوتا تو شاید ماں باپ سے تو اسی طرح بات کرتی۔"
بُوا نے دوسرا بھرپور طنز کیا۔ اس طنز سے وہ بلبلا گئی۔ یہی تو وہ بات تھی جس نے پروین کی دنیا تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ وہ بے اختیار رو پڑی۔ ماں نے بوا کو بلا لیا۔ پھر میاں سے کچھ تنہائی میں باتیں کیں۔ دونوں متفکر ہو گئے۔

شام کو کھانا کھانے کے بعد باپ نے بیٹی کو سمجھانا شروع کیا۔" بیٹی میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میری نظر میں وہ سارے نوجوان ہیں جن سے تمہارا رشتہ کیا جا سکتا تھا۔ قاضی صاحب کا لونڈا محض کندہ ناتراش ہے۔ مفتی احسان اللہ کا لڑکا نرا ملا۔ سیٹھ جمال کا لڑکا خوبصورت ہے۔ لیکن کچھ پڑھ لکھ نہ سکا۔ الطاف اللہ صاحب کا گھرانہ بہت باعزت ہے لیکن اس گھرانے کا ہر نوجوان عیاش اور شرابی ہے۔ اب کیا میں ان میں سے کسی کو اپنی پیاری بیٹی سونپ دیتا۔ لے دے کے یہ غریب ٹیچر جنچا۔ تو بیٹی بے عیب تو ذات خدا کی ہے۔ کالا پن کسی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ جسے جیسا چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ پھر کون جانے کل کیا ہو۔ نسرین کو تم نے دیکھا، کیسی پھول سی بچّی تھی۔ عین جوانی میں چیچک نکلی اور اس غریب کا چہرہ کھنڈر ہو کر رہ گیا۔ میری رائے ہے کہ صبر سے کام لو۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر تم کو اس کی کوئی ایسی عادت پسند آجائے اور وہی کالا چہرہ تم کو خوبصورت نظر آنے لگے۔ نگار کو دیکھو کیسی خوبصورت ہے۔ لیکن اس کا شوہر اس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس نے ایک سانولی سلونی طوائف کو گھر میں ڈال لیا۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ خوبصورت نگار کے مقابلے میں وہ سانولی اُسے بھا گئی۔ بیٹی! میں نے دنیا بہت

دیکھی ہے۔ مجھے تمہارا یہ کالا سراج ہزاروں چاند اور ستاروں سے اچھا لگتا ہے۔ اس کی پہلی شرافت یہی دیکھو جو اس نے پہلی بار تمہاری برہمی پر برتی۔ وہ تم کو اس طرح بدنام کر کے طلاق دے سکتا تھا کہ ہم سب موت کی دعا کرنے لگتے۔ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے مگر اس نے کس احتیاط سے کام لیا۔ ذرہ برابر جبر نہ کیا۔ قانونی و شرعی دونوں حیثیتوں سے وہ تمہارا شوہر ہو چکا۔ وہ چاہے تو تم کو اس گھر سے اُٹھوا لے۔ پڑھ لکھ کر ملمع پر ہی تمہاری نظر ٹک گئی۔ ملمع کے اندر تم نہیں دیکھ سکتیں، افسوس صد افسوس!

والد محترم! اپنا وعظ ختم کر کے خاموش ہو گئے۔ پروین ٹس سے مس نہ ہوئی، صبح ہوئی تو محلے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ یہ باتیں کسی نہ کسی طرح اس گھر میں بھی پہنچتی تھیں۔ پروین کے کانوں میں پڑتیں۔ اسے بڑی وحشت ہوتی۔ پھر ایک دن ماں نے کہا کہ بادشاہ تک تو اپنے گھر بٹھا کر بیٹی کو کھلا نہیں پاتا تو پروین کو بڑا برُا لگا۔ اسی ہفتہ وہ گرلس کالج کی پرنسپل صاحبہ سے جا کر ملی اور اس کے دسویں دن وہ بورڈنگ ہاؤس کی انچارج کی معاون بن کر وہیں چلی گئی۔ ماں باپ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

بورڈنگ ہاؤس میں وہ ہر وقت اپنے کو مصروف و مشغول رکھنے کی کوشش میں رہتی۔ کوئی کام نہ ہوتا تو اقامتی لڑکیوں کے پُرانے جمپروں کی مرمت کا کام لے بیٹھتی۔ ایسی خدمات سے وہ استانیوں اور لڑکیوں سب میں ہر دلعزیز تو ہو گئی لیکن اس کے چہرے پر جو برہمی شادی کے دن نمایاں ہوئی تھی۔ اس میں کمی نہ ہوئی وہ ہنستی تو اسے ایسا لگتا جیسے دل میں بیٹھا کوئی اس کے قہقہے اندر کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور یہ دل میں بیٹھا ہوا چور وہی اس کا

وہ کانٹا تھا کہ ہائے قسمت میں شوہر کا لابدا تھا وہ اس کانٹے کو نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکی وہ چاہتی تھی کہ سراج کا خیال اسے نہ آئے۔ مگر وہ اسے جتنا ہی بھولنے کی کوشش کر رہی تھی اتنا ہی وہ یاد آئے جا رہا تھا۔ ایک دن وہ بہت پریشان تھی۔ سراج بُری طرح اس کے خیالات پر چھایا جا رہا تھا۔ وہ اس سے طلاق لینے کی تدبیریں سوچ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے پرنسپل صاحبہ سے اجازت لے کر سیر کی ٹھانی۔ پانچ چھ بڑی لڑکیوں کو ساتھ لیا اور جمنا کی طرف چلدی۔ برقعہ اس نے اوڑھ رکھا تھا مگر نقاب اُلٹی ہوئی تھی۔ عصر کے وقت تک لڑکیوں کے ساتھ وہاں رہی۔ پھر واپسی کا ارادہ کیا۔ ٹیکسی کا راستہ دیکھنے لگی۔ وہ سڑک پر منتظر کھڑی تھی کہ لڑکیوں نے ایک ٹیکسی آتے دیکھی۔ دور سے صرف ڈرائیور نظر آرہا تھا۔ لڑکیوں نے ہاتھ اُٹھائے۔ ٹیکسی پاس آکر رُک گئی۔ پروین لڑکیوں کو لے کر بڑھی۔ مگر اندر سراج بیٹھا نظر آیا۔ "ارے!" جیسے کسی نے تیر مارا ہو۔ وہ سراج کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹی۔ نقاب کو اس نے چہرے پر کھینچ لیا اور لڑکیوں سے کہا "ادھر آؤ" لڑکیاں ہٹ گئیں۔ وہ بھی سمجھ گئیں کہ ٹیکسی خالی نہیں ہے۔ لیکن جب سراج نے دیکھا تو وہ ان سب کی ضرورت سمجھ گیا۔ اس وقت محمود صاحب کے یہاں وہ ان کی دعوت پر جا رہا تھا۔ انھوں نے ہی اسے لانے کیلئے ٹیکسی بھیجی تھی۔ وہ سڑک کے دوسری طرف اُتر پڑا۔ ڈرائیور سے کہا کہ ان سب کو گرلس کالج پہنچا دو اور خود اسکوٹر پر بیٹھ کر محمود صاحب کے دولت کدہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈرائیور نے لڑکیوں سے سراج کی بات دہرائی۔ پروین کا اشارہ پا کر سب بیٹھیں۔ ڈرائیور

سب کو کالج کے بورڈنگ پر پہنچا آیا اس سے کرایہ دریافت کیا گیا تو اس نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے بتایا کہ کرایہ محمود صاحب دیں گے۔ اور پھر اس نے اتنا اپنی طرف سے کہہ دیا کہ مجھے جلد وہاں پہونچنا ہے۔ ابھی ابھی سراج صاحب "موجودہ سماج کی بدحالی" پر تقریر فرمائیں گے۔ میں بھی سنوں گا۔

بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ یہ کہنے کا یہاں کیا موقع تھا۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ انسان جس بات سے کٹنا چاہتا ہے وہ اسے اور زیادہ جکڑتی ہے۔ پروین کے لئے یہی کیا کم تھا کہ سراج سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی، کجا یہ ڈرائیور اس کی تعریف کر گیا۔ وہ دیر تک جھنجھلائی سی رہی۔ پھر رات کو حمیدہ نے کھانا کھاتے کھاتے کہا "باجی! وہ لکچرر صاحب کتنے اچھے تھے۔ اگر اس وقت اپنی ٹیکسی نہ دیتے تو ہمیں دیر ہو جاتی۔

پروین کچھ نہ بولی۔ حمیدہ کو لکچرر صاحب، وہی کالے کلوٹے سراج صاحب اچھے لگ رہے تھے۔ پروین کو یاد ہے اس کے والد نے وعظ پلاتے ہوئے ایک جملہ کہا تھا" دراصل سیرت کا نور جب چہرے پر جھلکتا ہے تو کالا آدمی بھی خوبصورت نظر آنے لگتا ہے۔ آج پروین نے سنجیدگی سے غور کیا تو اُسے فیصلہ کرنا پڑا کہ اس نے سراج صاحب کے معاملے میں بہت غلو سے کام لیا ہے۔ دراصل وہ اتنا کالا نہیں، جیسا کہ پروین کی نظریں اسے دیکھ رہی تھیں۔ خیر یہی کچھ پروین سوچتے سوچتے سو گئی۔

اس کے بعد پروین نے یہ احتیاط لازم کر لی کہ جب اسے لڑکیوں کو کہیں لے کر جانا ہوتا تو وہ نقاب ڈالے رہتی تاکہ سراج کہیں آتا جاتا دیکھے تو وہ سمجھ نہ سکے کہ یہ کون آرہا ہے

یاآرہی ہے۔ ایک بار وہ اسی احتیاط کے ساتھ ایک فنگشن سے آرہی تھی۔ لڑکیوں نے تقاضا کیا کہ باجی آزاد پارک راستے میں بن رہا ہے اسے دکھاتی چلو۔ پروین ان کو لے کر وہاں پہنچی توچند لونڈوں نے شرارت شروع کردی۔ وہ پہلے تو دور سے پھبتیاں کستے رہے۔ پھر دھیرے دھیرے قریب آنے لگے۔ پروین گھبراگئی اتنے میں ایک طرف سے آواز آئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے"

یہ ڈانٹ سراج کی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہ ٹیڈی بوائے ان لڑکیوں خصوصًا بُرقع پوش کے پیچھے لگے ہیں۔ اس کی ڈانٹ سُن کر لونڈے منتشر ہو گئے اور پھر پروین جھٹ پارک کی حدود سے نکل کر ایک ٹیکسی پر کالج کی طرف بھاگی۔ کالج آکر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ آج سراج نے اسے نہیں پہچانا۔ ایک عورت اور اس کے ساتھ بے بس بچّیوں کو نالائق لونڈوں سے بچانے کے لئے اس شریف نے شرافت کا ثبوت دیا۔

"شریف نے شرافت کا ثبوت"۔ یہ کیسا فقرہ وہ دل ہی دل میں کہہ گئی اُسے یاد آیا کہ اس کے باپ نے بھی اس سے مِلتا جُلتا ایک فقرہ کہا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ باپ نے یہ بھی کہا تھا "بیٹی! ہوسکتا ہے کہ تیرے کالے سراج کی کوئی اچھی بات تجھے پسند آجائے۔ تو صبر کر۔"

آج اسے سوتے سوتے ایسا محسوس ہوا کہ سراج ہے تو کالا لیکن ناک نقشے کا بُرا نہیں۔ اور یہی سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔

اور پھر ایک دن کا واقعہ ہے۔ واقعہ نہیں حادثہ کہ وہ لڑکیوں کے ساتھ قلعہ دیکھنے گئی

وہاں چند غنڈوں نے پہلے "او چاند کی کرن" کہہ کر اسے پکارا۔ پھر اس ارادے سے بڑھے کہ اسے اغوا کرلیں۔ پروین لڑکیوں کے ساتھ ایک طرف کو بڑھی ادھر کچھ لوگ تھے لیکن غنڈے بیچ میں آ گئے۔ اس وقت بھی ایک زوردار "خبردار" کی آواز بلند ہوئی اور سراج غنڈوں کے سر پر جا پہونچا۔ لیکن شاید آج غنڈے "خبردار" ہی تھے ایک نے کہا "ابے کیا تیری بہن تھی جو تجھے بُرا لگا۔" یہ بات سراج کو لگ گئی۔ اس نے پھر ڈانٹا "بکتا کیا ہے اس ڈانٹ کے ساتھ ہی رامپوری کرّے دار چاقو کے کھلنے کی آواز آئی۔ اور جب تک سراج پیچھے ہٹا۔ چاقو اس کی ران پر پڑا۔ وہ زمین پر "ہائے" کہہ کر گرا۔ لوگ دوڑ پڑے۔ غنڈے یہ جا وہ جا فرار ہو گئے۔ پروین لڑکیوں کو لے کر بھاگی اور اس نے کالج میں آکر دم لیا۔ اتفاق سے پرنسپل شاید دیکھ بھال کے لئے بورڈنگ میں آئی ہوئی تھی ۔ انھوں نے حال پوچھا۔ پروین تو کچھ نہ کہہ سکی لڑکیوں نے سارا حال بتایا۔ صبح کو اخبار میں بھی آگیا کہ کس طرح اورنٹیل کالج کے ہر دلعزیز ٹیچر کو چند غنڈوں نے زخمی کر دیا۔ اخبار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سراج صاحب داخل اسپتال ہیں۔ بورڈنگ کی انچارج مس کملاوتی نے پرنسپل سے اسپتال جانے کی اور سراج صاحب کی عیادت کے لئے اجازت چاہی تو پرنسپل صاحبہ خود تیار ہو گئیں۔ انھوں نے پروین سے کہا کہ وہ بھی چل سکتی ہے لیکن پروین نے انکار کر دیا اور بہانہ کر دیا کہ وہ سہمی ہوئی ہے۔ پھر چلی جائے گی۔

اسپتال سے واپس آکر پرنسپل صاحبہ اور کملاوتی نے سراج صاحب کی تعریفوں کے پُل باندھ دئے۔ "غیر کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈالتے آج کل سراج ہی کو دیکھا۔ جس وقت

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا تو کیسا شرما گئے تھے اور شرماتے وقت ان کے چہرے پر جو بھولا پن چھایا تو بالکل دیوتا نظر آرہے تھے۔ خدا ان کو جلد اچھا کر دے۔ ہائے بیچاری اس کی بیوی کیسا کیسا تڑپ رہی ہوگی۔ بھگوان اس کا سہاگ قائم رکھے۔

یہ تعریفی کلمات سُن کر پروین تڑپ گئی۔ وہ سن نہ سکی وہاں سے ہٹ گئی وہ اپنے کمرے میں جاکر لیٹ رہی۔ لیٹ کیا رہی نہ جانے کیا سوچ سوچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی وہ خوب روئی پھر جب اس کا دل ذرا سنبھلا تو اس نے پرنسپل سے اجازت لی کہ وہ بھی ماسٹر صاحب کو دیکھنے جائے گی ــــ اسے اجازت تھی ہی۔ اجازت پاکر وہ پہلے گھر گئی۔ وہاں سنا کہ والدہ سراج کو دیکھنے گئی ہیں۔ اس نے بوا کو ساتھ لیا اور اسپتال کو چلدی۔

جس وقت وہ مریض کے مخصوص وارڈ میں پہنچی تو وہاں اس کی والدہ اور اس کی ساس دونوں موجود تھیں۔ اس کی والدہ اس کی ساس سے رو رو کر گویا اپنا دل دکھا رہی تھیں اور ساس "قسمت کی بات قسمت کی بات" کہہ رہی تھیں۔ سراج اس وقت سو رہا تھا۔ دونوں نے پروین کو آتا دیکھا تو باہر نکل گئیں۔ پروین نے ساس کو سلام کیا۔ پھر جب پلٹ کر دیکھا کہ دونوں نظر سے اوجھل ہیں تو بوا سے کہا کہ وہ بھی باہر جائے۔ کوئی نرس بھی قریب نہ تھی وہ مریض کو دیکھنے لگی اور سوچنے لگی کہ اگر اس وقت یہ بیدار ہو جائے تو وہ کیا کہے گی اور وہ کیا کہے گا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد اس کی ماں اور ساس پھر کمرے میں آئیں تو دونوں حیران رہ گئیں۔ پروین مریض کے پیر پولے پولے ہاتھوں سے دبا رہی تھی اور آنکھوں سے

آنسو بہا رہی تھی۔ دونوں خواتین یہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں واپس ہوگئیں اور انھوں نے بُوا کو بھی اپنے پاس بلا لیا جو پروین کے پاس جا رہی تھی۔ دونوں دنیا دیکھے ہوئے تھیں سمجھ گئیں کہ پری آپ سے آپ شیشی میں اُتر گئی۔ سمدھنیں آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہی تھیں۔

رضیہ اور سکینہ بھی تن من سے قرارت کے مقابلے کی تیاری میں مصروف تھیں
رضیہ سکینہ سے دو برس چھوٹی تھی۔ رضیہ کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور سکینہ کی ۱۵ برس کی۔ وہ دونوں
سگی بہنیں تھیں ۔

اس سے پہلے مدرسہ اسلامیہ نسواں میں قرارت کے جو مقابلے ہو چکے تھے۔ اس
میں سکینہ نے ہمیشہ اول نمبر حاصل کیا اور رضیہ دوم آتی رہی۔ رضیہ کو کبھی خیال نہیں آیا کہ
بڑی بہن سکینہ کے مقابلے میں دوم کیوں آئی لیکن اس مرتبہ وہ اس کوشش میں تھی کہ
سکینہ سے بڑھ جائے۔ اول نمبر خود حاصل کرلے۔ اس شوق نے اس کی کوشش کو
اتنا تیز کر دیا تھا کہ اسے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی بھی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ سکینہ
اسے کھانے کے وقت پکڑ لے جاتی اور وہ جبراً و کرہاً دسترخوان پر جاتی۔ سکینہ
اسے یہ بھی سمجھاتی کہ وقت بے وقت کھانے پینے سے آواز پر بُرا اثر پڑتا ہے۔
اور ہر وقت پڑھتے رہنے سے گلا خراب ہو جاتا ہے۔

سکینہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک دن وہ رضیہ کو قرارت کے رموز بتانے

میں مدد دینے لگی تو رضیہ نے جھڑک دیا۔ " میں نہیں لیتی تمہاری مدد"۔ سکینہ منھ تک کر رہ گئی۔ اسے یاد آیا، ایک دن وہ قرارت کی مشق خود ہی کر رہی تھی ـــ اسے یاد آیا۔ رضیہ دروازے سے لگ کر کھڑی سنتی رہی اور پھر امی سے جاکر کہا۔" اگر آپا جان نہ ہوں تو میں اس بار اوّل آسکتی ہوں "۔

اس وقت تو سکینہ ہنس دی لیکن آج جب رضیہ نے جھڑک دیا تو اسے محسوس ہوا کہ شاید رضیہ حسد کی آگ میں سلگنے لگی ہے۔ اس نے موقع پاکر ایک دن اسے پھر پکڑا اور سمجھانے لگی۔ بھنّو! تو ہی اول آئے گی۔ اللہ کرے تو ہی اوّل آئے۔ اب تو میری آواز موٹی ہوگئی ہے میں سوچتی ہوں کہ مقابلے میں شریک نہ ہوں۔

" سچ آپا جان"! رضیہ چہک اُٹھی۔

" سچ! بھنّو، قسم لے لو! "

" اور اگر ابّا جان نے ڈانٹا تو ؟ "

سکینہ اس سوال کے جواب میں رضیہ کو مطمئن نہ کر سکی۔ اور پھر جب رضیہ ہی نے شدہ شدہ ماں سے اور پھر ماں نے قاضی ارشاد احمد صاحب سے کہا کہ سکینہ کا ارادہ یہ ہے تو واقعی انھوں نے سکینہ کو بہت ڈانٹا اور پھر بیوی سے تنہائی میں کہا کہ امام جامع مسجد کا فرزند ارجمند قاری جواد اس شرط پر شادی کرنے پر راضی ہوا ہے کہ سکینہ مقابلے میں اوّل آئے۔

یہ سُن کر ماں نے خاموشی اختیار کر لی اور پھر جب کبھی بات آئی تو ماں نے بڑی

بیٹی کو بند بند لفظوں میں سب کچھ بتا بھی دیا۔

ماں باپ کو سکینہ کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ دونوں خوش تھے کہ سکینہ امتحان میں ضرور اوّل آئے گی اور اس کی شادی ایک اچھے گھرانے میں ہو جائے گی۔ سکینہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی وہ رضیہ کو اکثر اُداس دیکھتی اور کسی خیال میں کھو جاتی۔ موقع ملتا تو وہ چھوٹی بہن کا حوصلہ بڑھاتی کہ ہمت نہ ہار اب کی بار سب سے زیادہ نمبر تیرے ہی آئیں گے۔

رضیہ یہ سب سکینہ کی بناوٹ سمجھتی اور کبھی کبھی طنز بھی محسوس کرتی۔ وہ ماں باپ کے ڈر سے مقابلہ کی تیاری تو ضرور کر رہی تھی لیکن اسے اُمید نہیں تھی کہ بڑی بہن کے مقابلے میں اول انعام مل سکے گا۔

قصّہ مختصر یہ کہ مقابلے کا دن آیا۔ مدرسہ اسلامیہ نسواں میں بڑے انتظامات کئے گئے تھے۔ نمبر دینے والوں میں اندر تین بہترین قاری خواتین تھیں اور پردے کے باہر دو پُرانے بوڑھے قاری۔

مدرسہ اسلامیہ نسواں کا صحن عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے اسٹیج پر کچھ معزز خواتین کے ساتھ وہ لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں جو مقابلے میں حصہ لینے والی تھیں۔ صدر جلسہ کی مختصر تقریر کے بعد مقابلہ شروع ہوا۔ کمسن بچّیوں کی مترنّم آواز فضا میں گونجی اور اس گونج میں کلام پاک کے میٹھے بول مجمع نے سنے تو جھوم اُٹھا۔

قراءت کرنے والی لڑکیاں ایک ایک کر کے آتی رہیں۔ قراءت کر کے اپنی جگہ واپس

جاتی رہیں۔ سننے والے ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہے اور نمبر دینے والے نمبر دیتے رہے۔ اس درمیان محترمہ صدر صاحبہ نے سکینہ کا نام لیا۔ سکینہ نہایت اطمینان سے اُٹھی۔ مجمع کی نظریں اس پر جم گئیں۔ فضا ساکت ہوگئی! اچانک سکینہ نے "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" کے الفاظ منہ سے نکالے اُف ایک نہایت کریہہ موٹی اور بھدّی سی آواز مجمع نے سنی اور پھر سکینہ کو کھانسی کا ٹھنکا جو شروع ہوا تو کھانستی رہی اور سننے والے اپنی نظروں سے گویا کہنے لگے "ارے اسے کیا ہوگیا ہے۔"

سکینہ نے کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی۔ اب تو مدرسہ اسلامیہ نسواں کے صحن کی فضا میں انتشار پیدا ہوگیا۔ سکینہ کی ماں اپنی جگہ کھڑی ہوگئی، اور اس نے کلیجہ پکڑ لیا۔ "ہائے میری بچی! سکینہ سورہ اخلاص پڑھ کر اُٹھ گئی۔ اور جس اطمینان سے قرارت کرنے آئی تھی اسی اطمینان کے ساتھ اُٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ رضیہ اس کی ناکامی پر بہت خوش ہوئی اور پھر جب اس کا نام پکارا گیا تو اس نے بڑے حوصلے اور اُمید کے ساتھ قرادت کی، سننے اور دیکھنے والے بڑی عمر کے لوگ تو الگ رہے، ناسمجھ بچیاں اپنی جگہ کھڑی ہو کر رضیہ کو دیکھنے لگیں۔

رضیہ نے بہترین تجوید کے ساتھ قرارت کی۔ اس کے بعد بقیہ لڑکیوں نے حصّہ لیا۔ پھر اوّل انعام کا اعلان کیا گیا تو رضیہ کا سر غرور سے اونچا ہوگیا۔ خدا جانے یہ اس کا طنز تھا یا سعادت مندی، اس نے انعام کا کپ لاکر سکینہ کے آگے رکھ دیا۔ سکینہ نے مسکرا کر رضیہ کا منہ چوم لیا اور اسے مبارکباد دی۔

انعام تقسیم ہونے کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ خواتین خوش خوش اپنے گھروں کو گئیں۔ ہاں ایک عورت رو رو تی ہوئی واپس ہورہی تھی۔ یہ عورت تھی قاضی ارشاد احمد صاحب کی بیوی، ناکام سکینہ اور کامیاب رضیہ کی ماں۔ اس کے سینے سے آہ اُٹھتی تھی۔ اور وہ کہہ رہی تھی کہ ہائے اب سکینہ کا بنے گا۔"

قاضی صاحب نے بھی اس خبر کو سانحہ کی طرح سنا وہ بھی دل پکڑ کر رہ گئے۔

شام کو انھیں امام جامع مسجد کا پرچہ ملا کہ بیٹا قاری جو ا در رضیہ سے شادی کرنے پر تو راضی ہے اور وہ اس کے لئے دو تین برس انتظار بھی کر سکتا ہے لیکن سکینہ سے کسی حال میں شادی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر آپ کو منظور ہو تو تحریری منظوری دے دیں ورنہ میں کہیں اور اپنے بیٹے کے لئے پیغام دوں۔

اچھے لڑکے آج کل کہاں ملتے ہیں۔ رضیہ کے لئے ہی منظوری دیدی گئی اور سکینہ کے لئے بر تلاش کیا جانے لگا۔ بڑی مشکل سے ایک لڑکا ہاتھ آیا اور ماں باپ نے بڑی حسرت کے ساتھ اسی کے عقد میں سکینہ کو دے دیا۔ سکینہ نے خوشی خوشی قبول کر لیا اور اپنے شوہر کے گھر چلی گئی۔ چلتے وقت اس نے اپنا بستہ ماں کو دے کر کہا۔

"اس میں میری کتابیں اور کاپیاں ہیں۔ انھیں رکھ لیجئے۔ دو برس کے بعد رضیہ درجہ ہفتم میں پہنچ جائے گی تب اسے دیدیجئے گا۔ یہ میری طرف سے اس کے لئے تحفہ ہے۔"

ماں نے بستہ رکھ لیا۔ سکینہ گھر والی ہو گئی۔ دو برس کے بعد جب رضیہ درجہ ہفتم میں آئی تو بہن کا بستہ اُسے ملا۔ اس نے بڑے شوق سے کھولا۔ کتابوں اور کاپیوں پر نئی جلدیں

بندھی ہوئی تھیں۔ رضیہ بہت خوش ہوئی۔ شام کو اس نے سوچا کہ آپا جان کی کاپیوں سے لکھے ہوئے اوراق الگ کر دینا چاہیئے تاکہ اُستانی صاحبہ ڈانٹیں نہ۔

وہ ایک ایک ورق بڑی احتیاط سے پھاڑ پھاڑ کر نکال رہی تھی۔ اس طرح کئی کاپیاں اس نے سادہ کرلیں۔ اچانک ایک کاپی کے ایک ورق پر اس کی نظریں جم گئیں۔ اس نے پڑھا۔ تحریر تھا :۔

"رضیہ کو یقین نہیں آتا وہ میرے ہوتے ہوئے اوّل آئے گی۔ میرا بھی خیال ہے کہ وہ میرے مقابلے میں زیادہ نمبر حاصل نہ کر سکے گی تو کیا میں خود اوّل انعام لے کر اپنی پیاری رضیہ کو اُداس کر دوں۔ نہیں۔ نہیں! میں ہرگز اُسے اُداس نہیں دیکھ سکتی۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیئے ہاں ٹھیک ہے تھوڑا سا سیندور پھانک لینا چاہیئے تاکہ گلا بیٹھ جائے اور بروقت قرارت اگر میں چاہوں بھی تو اچھی قرارت نہ کر سکوں۔"

یہ تحریر پڑھ کر رضیہ کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ وہیں بے ہوش ہو گئی ماں باپ دوڑے۔ بیٹی کے پاس کاپی کھلی ہوئی پڑی تھی۔ انھوں نے بھی وہ تحریر پڑھی ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ پڑی۔ اور وہ رضیہ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

موم کی گُڑیاں

" امّی جان! امّی جان! سلمٰی آ رہی ہے!" زرینہ ہانپ رہی تھی۔ "تم جلدی سے جاکر کپڑے بدل لو امی جان! عیدوالا جوڑا پہننا، امّی جان!"

امّی برتن دھو رہی تھیں۔ انھوں نے زرینہ کی طرف دیکھا۔ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے زرینہ کے لئے زلزلہ آ گیا ہو۔

"بڑی خوشی کی بات ہے بیٹی! اچھا تو میں یہ برتن ٹھکانے سے رکھ دوں۔"

"نہ آپ تو جلدی سے اچھا جوڑا پہن لیجئے۔ یہ برتن میں دھوئے ڈالتی ہوں۔"

امی جان کو ہنسی آ گئی۔ پھر پوچھا "بیٹی سُن تو! میں جوڑا کیوں پہن لوں، کیا کوئی مجھے دیکھنے آ رہا ہے؟"

"اونہہ، تم تو ہر بات میں بحث کرنے لگتی ہو امّی! دیکھو تو تمہارے کپڑے کیسے میلے ہو رہے ہیں۔ وہ دیکھے گی تو کیا کہے گی؟"

"کہے گی کیا بیٹی، سلمٰی تیری سہیلی ہے، وہی تو آ رہی ہے، اس کے سامنے تکلف کیا۔ میری بھی تو وہ بیٹی ہوئی!"

"ہاں ہوگئی سب، تم برتن چھوڑ دو بس اب وہ آیا ہی چاہتی ہے۔" زبردستی زرینہ نے برتن کھینچ لئے اور کھنگال کر ایک طرف رکھ دئیے۔

امّی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ زرینہ انھیں حکم دے رہی ہے یا التجا کر رہی ہے۔ وہ کپڑے بدلنے چلی گئیں۔ وہاں آپ ہی آپ کہہ رہی تھیں "معلوم نہیں زرینہ کو کیا ہو گیا ہے کیسی بھولی بھالی تھی۔ لیکن جب سے کالج میں داخلہ لیا ہے، چٹک مٹک سے رہنے لگی ہے۔ بالکل ہی تو بدل گئی صرف تین چار مہینوں میں۔ کل ہی تو میں سمجھا رہی تھی کہ بھنّو! ہم کوئی رئیس نہیں ہیں۔ جو مل جایا کرے پہن لیا کرو، جواب دیا کہ نہ، چاہے کھانے کو نہ دو مگر جوڑا بھڑک دار ہو، وہاں سب بنی ٹھنی رہتی ہیں۔ امی جان! کیسا دکھاوا آگیا ہے، امی جان کی بچّی میں۔"

امی جان نے ایک صاف سا جوڑا پہن لیا۔ سادہ سا جیسی ایک گرہست ہوتی ہے اور پہنا کرتی ہے پھر کچھ سوچ کر زیرِلب بڑبڑانے لگیں۔

"اس دن کیسا تڑ سے جواب دیا اس نے" ماں، اگر ہمیں عزت قائم رکھنا ہے تو اوپر اٹھنا ہوگا۔" پھر نہ جانے کس شاعر کا شعر پڑھا مطلب یہ تھا کہ ہمیں زمین کی پستی کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے۔ آسمان کی بلندی کی طرف نظر رکھنا چاہیئے۔ دیوانی یہ نہیں جانتی کہ جو آسمان کی طرف دیکھتا ہے، زمین میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔"

امی کو غصہ بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی انھوں نے آج طے کر لیا تھا کہ وہ زرینہ کو سبق دیکر رہیں گی مگر اس طرح کہ اُسے بُرا نہ لگے۔

آج سلمیٰ اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ اس کی امی بھی آئیں۔ انھیں دیکھ کر زرینہ خوشی

کے مارے پھولی نہ سمائی۔ کتنی ہنس مکھ ہیں سلمیٰ کی امی کتنا اچھا ہے ان کا ڈریس جمپر کا گلا تو ایسا بنایا ہے کہ بس واہ ہی وا۔ اور کلی دار پیجامہ میں کیسی عمدہ چنٹیں ہیں۔ اور سلمیٰ ــــ اُف میرے اللہ! وہ پوری سلمہ ستارہ بن گئی ہے۔"

"آئیے آنٹی! آج تو بہت دنوں بعد آپ کو ہماری یاد آئی۔" زرینہ نے دل ہی دل میں اپنے لفظوں کی داد دی۔ اس کی امی ابھی باہر نہیں آئی تھیں۔ زرینہ خوشی سے پکاری۔" امی جان"! آواز کے ساتھ ہی اس کی امی جان باہر آتی دکھائی دیں۔ اور زرینہ کا کھلا ہوا چہرہ یکدم مرجھا گیا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

"کیسا کیسا کہہ دیا تھا اور اب بن ٹھن کر آئی ہیں۔ توبہ توبہ وہی سفید شلوار، وہی پُرانا جمپر اور موٹا سا دوپٹہ۔ زرینہ نے اپنی آن بچانے کی خاطر سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں کھینچ لے گئی اس کی امی سلمیٰ کی ماں سے بڑے تپاک سے ملیں۔ آدھے گھنٹے ہی میں دونوں ایسا گھل مل کر باتیں کرنے لگیں جیسے ان کے درمیان کوئی تکلف ہی نہ ہو، اور جیسے وہ ایک جان دو قالب ہوں۔ کبھی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو جاتیں اور کبھی اس طرح ہنستیں کہ ان کی ہنسی کی آواز زرینہ کے کمرے میں سنائی دیتی۔ اس آواز سے زرینہ نے محسوس کیا کہ اتنی یگانگت اور بے تکلفی چار مہینے میں سلمیٰ سے اس کی نہ ہو سکی۔ اس کا خیال تھا کہ امی جان احساس کمتری میں مبتلا ہوں گی اور سلمیٰ بھانپ لے گی۔ اسی لئے وہ ادھر اسے گھسیٹ لائی تھی اور جھوم جھوم کر باتیں کر رہی تھی۔

"کل تو نے کملا کو دیکھا تھا کیسی گڑیا سی بن کر آئی تھی اسکول میں۔ سب ہی تو اسے دیکھ

رہے تھے"۔ دونوں ہنسنے لگیں۔ اس وقت زرینہ کی حسرت بھری نگاہیں سلمیٰ کی پہلی اسکرٹ پر جم کر رہ گئیں اور وہ اپنی آہ کو دبا نہ سکی۔ کب سے وہ ابا اماں سے اس کے لئے ضد کر رہی تھی۔ مگر یہاں بس وہی پیسہ بیچ میں آجاتا تھا۔ آج میرے پاس بھی اسکرٹ ہوتی تو ــــــــ!" اس نے دل ہی دل میں اپنی غریبی محسوس کی اور اُداس ہو گئی۔

کیا تین ہی کمرے ہیں تمہارے پاس ؟" سلمیٰ پوچھ بیٹھی۔ زرینہ اور زیادہ اُداس ہو گئی۔" ایسے پوچھ رہی ہے جیسے پہلے پہل آئی ہو"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔" اور جواباً بولی "سلمیٰ! کیا یہ وہی اسکرٹ ہے نا جو تو نے اس دن فنکشن میں پہنا تھا اور اس دن بھی جب اسکول میں اندراجی پدھاری تھیں"۔ اس طرح گویا اس نے تین کمروں والی بات، بات نہیں پوشیدہ طنز کا جواب دے دیا۔ مطلب یہ کہ تو بھی تو ایک اسکرٹ مہینوں سے پہن رہی ہے۔ پھر میرے پاس تین ہی کمرے ہیں تو کیا ہوا۔

لیکن اس کے جواب میں جب سلمیٰ نے بتایا کہ اس کے ابا جان نے کانپور سے قمیص چوڑی دار پاجامے کا کپڑا بھیجا ہے تو آئے گی تو دکھاؤں گی، تو زرینہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اس نے پوچھا" کس رنگ کا ہے؟" میرے خالو جان نے بمبئی سے بھیجا تھا مگر اس کا رنگ مجھے پسند نہیں تھا"۔ میں نے پھوپی کی لڑکی سعیدہ کو دے دیا۔

اس کا جواب سلمیٰ نے کچھ نہیں دیا۔ پھر کہنے لگی کتنی گرمی ہے یہاں۔ ہمارا گھر خوب کھلا ہے۔ ہوا خوب آتی ہے۔ اس بند گھر میں مجھ سے رہا نہ جائے۔ اور اس کے جواب میں زرینہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔" خوشی میں یہ تو بھول ہی گئی کہ چائے وائے بناؤں چلو ذرا تم امی

جان کے پاس بیٹھو، میں ابھی لاتی ہوں۔

"تم بے کار تکلف کر رہی ہو۔" کہتی ہوئی سلمیٰ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر دونوں دنگ رہ گئیں۔ کس ٹھاٹ سے دونوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ زمین پر بچھے ہوئے گدے پر بیٹھی تھیں۔ سلمیٰ نے پہونچتے ہی ماں پر آوازہ کس ہی دیا۔

"ممّی صاحب! آج تو پوری انڈین بن گئی ہو!"

"بن کیا گئے رہیں ہی ہندوستانی۔ کیوں بہن جی ٹھیک ہے نا!" سلمیٰ کی امی نے ایک سانس میں اس سے اور زرینہ کی ماں سے کہا۔

"اور کیا" زرینہ کی امی کہنے لگیں۔" ہندوستانی تو ہیں ہی۔ میں تو زرینہ کو سمجھاتی ہوں کہ اپنی آن کبھی نہیں کھونا چاہئے۔ جھوٹی شان کبھی نہیں دکھانا چاہئے مگر وہ تو فیشن کے پیچھے دیوانی ہوئی جا رہی ہے۔"

زرینہ کا چہرہ یکدم اُتر گیا۔ چائے بنانے کے بہانے وہ باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی مگر اس کے کان اسی طرف تھے۔

"ہائے امی جان اب تو گھر کا پورا پول کھول دینے پر تل گئی ہیں۔ کیا کیا کہے جا رہی ہیں اس چھوٹے سے گھر کی تعریف کر رہی ہیں۔ کہتی ہیں کتنا کم کرائے پر مل گیا ہے۔ لو ابا جان کی تنخواہ بھی بتا دی۔ آخر یہ کہنے کی ضرورت کیا تھی کہ گھر میں کوئی نوکر نہیں ہے۔ گھر کا کام وہ خود اور زرینہ دونوں مل کر کر لیتی ہیں۔"

زرینہ کا سر گھوم گیا۔ اُسے یاد آیا۔ اس نے سلمیٰ کے سامنے کیسی کیسی ڈینگیں ماری تھیں۔

سبھی لڑکیاں یہی جتاتی ہیں مگر کسی کی ماں کا ہے کو اس طرح اپنا بھانڈا پھوڑتی ہے۔ زرینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ امی یہ سب دُکھڑا کیوں لے بیٹھیں۔ بھولے پن کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سلمیٰ کی ماں نے یہ کب پوچھا تھا، جس کے جواب میں یہ بکواس شروع کر دی۔

چائے بنا کر اس نے ٹرے میں رکھی۔ ٹرے اُٹھا کر کمرے میں آئی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے۔ وہ سلمیٰ کی طرف بڑھی۔ سلمیٰ کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ سوچنے لگی۔ یہ کیوں اداس ہو رہی ہے اچھا یہ بات ہے۔ اس کی ممّی اب اپنی رام کہانی سنا رہی تھیں :۔

"اللہ کا شکر ہے۔ دونوں وقت آرام سے دو روٹیاں مل جاتی ہیں" لیکن وہ دن میں اب تک نہیں بھولی ہوں۔ جب اپنے ہاتھوں سے دوسرے لوگوں کے کپڑے سیتی تھی تب ہی ایک وقت کھانے کو ملتا تھا" سلمیٰ کی ماں کی آواز دُکھ بھرے دنوں کی یاد سے بھرا گئی اور سلمیٰ نے بُرا سا منہ بنایا۔

زرینہ کی امی نے کہا "لیجئے، اب آپ ہی اس پگلی کو سمجھائیے جب آپ آرہی تھیں اس وقت یہ برتن دھو رہی تھی۔ یہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ عید کا جوڑا پہن لو"

دونوں بزرگ عورتیں ہنس پڑیں۔ زرینہ بےحد شرمندہ ہوئی، لجائی ہوئی سلمیٰ بھی بیٹھی تھی۔ سلمیٰ کی ممّی نے کہا :۔

" آؤ بیٹی زرینہ! کیا اچھا نام ہے تمہارا، اور کیسی اچھی ہو تم" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ "بڑی اچھی بھنّو ہے" پھر اس طرح سمجھانے لگیں "بیٹی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں

دکھاوا کرنے سے خوشی نہیں ہوتی بیٹی! دکھاوا کرنے والے ایک طرف جھوٹ بولتے ہیں۔ دوسری طرف ان کے جھوٹ کا پول کھل کر رہتا ہے۔ تب ان کو خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"

زرینہ نے نیچی نظریں کئے ہوئے سلمیٰ کو دیکھا وہ بھی جھینپی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائیں۔ دراصل دونوں کو ایک نہایت قیمتی شئے مل گئی تھی۔ دونوں کے ذہنوں میں ایک بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ ایسی بیداری جس میں بناوٹ نہیں اور نہ اس میں فیشن کی جھوٹی چمک تھی۔"

نفلی روزہ

میں ایک ماڈرن خاندان میں پیدا ہوئی۔ میرے والد محترم آئی سی۔ ایس ہیں۔ اور اب عرصہ سے گوشہ نشین ہیں۔ میری والدہ ایک رئیس خاندان سے تھیں۔ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ لیکن نہایت خوبصورت اور مالدار گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ میرے والد صاحب نے (وہ خود بیان کرتے ہیں) ان سے شادی محض ان کے حسن اور مال کی وجہ سے کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے برکت دی اور ہم سب سات بھائی بہنیں ہیں۔ سب سے بڑی میں ہوں والد صاحب نے ہمیں اعلیٰ تعلیم دلائی اور اب ہم سب اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔ والدہ مرحومہ (خدا انھیں کروٹ کروٹ چین نصیب فرمائے) اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

ہمارے خاندان میں صرف والدہ مرحومہ ہی ایسی تھیں جو روزہ نماز کی پابند تھیں والد صاحب آئی۔سی۔ ایس تھے۔ ظاہر ہے ان کو دین سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ پھر ہم سب نے مغربی تعلیم پائی۔ مغربی طرز کی تربیت حاصل کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب والدہ مرحومہ کو روزہ نماز اور صدقہ و خیرات کرتے دیکھتے تو مذاق کرتے۔ ہم سب بھائی بہنوں کے الفاظ یہ ہوتے تھے۔

"امی اس سے کیا فائدہ۔ روزہ رکھ کر دن بھر بھوکے مرنا یہ کیا عقلمندی ہے۔ آپ نمازوں میں جو ٹائم برباد کرتی ہیں۔ اتنی دیر میں کوئی تفریح کر لیجئے۔ یہ جو سنڈے منڈے فقیروں کو خیرات دیتی ہیں تو ان کے بدلے ہمارے فنکشنوں میں چندہ دیجئے تو نام ہو۔

اور توبہ ہے والد صاحب تو۔ اکثر ہم نے دیکھا امی نماز پڑھ رہی ہوتیں اور وہ جا نماز کھینچ لیتے تھے۔ اب جبکہ اللہ نے میری آنکھیں کھولیں اور میں دین کو کچھ کچھ سمجھتی ہوں تو اپنی اور گھر کی بے ادبیوں پر لرز جاتی ہوں۔ توبہ۔ !

اچھا تو اس تمہید کے بعد میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں دین کی طرف کس طرح مڑی اس وقت میری عمر بھی بائیس برس کی تھی، ایم اے کر چکی تھی اور اعزازی طور پر ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ اس اسکول میں مس جمیلہ ایک اور معلمہ صاحبہ تشریف لائیں۔ یہ میری ہم عمر تھیں۔ نہایت بھولا بھولا چہرہ ہنس مکھ سادے کپڑوں میں وہی وہ تھیں۔ ہم سب سے الگ۔ تنہا میرا دل نہ جانے کیوں ان کی طرف کھینچنے لگا۔ رئیس گھرانے کی تو میں تھیں ہی۔ کسی سے سہیلا کرنے کے لئے دس بیس روپیہ خرچ کر ڈالنا میرے لئے معمولی بات تھی۔

میں نے اسی وقت ٹی پارٹی جما دی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب جمیلہ صاحبہ نے فرمایا کہ "بہن! میں تو روزے سے ہوں۔"

ان کا روزہ اس وقت مجھے کھلا۔ اگر میں ذرا مہذّب اور شائستہ نہ ہوتی تو اس وقت خدا جانے کیا کہہ اور کر ڈالتی۔ پھر بھی میری زبان سے نکل گیا۔ "نہ جانے لوگ روزہ رکھنے کی حماقت کیوں کرتے ہیں؟"

"حماقت!" مس جمیلہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا آپ مسلمان نہیں ہیں ؟"
"مسلمان تو ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔
"تو بہن روزہ فرض ہے اللہ کا حکم ہے۔ روزہ رکھو"۔
"کیوں رکھیں ؟" پھر میری زبان سے جھنجھلاہٹ کے ساتھ نکلا۔
"عرض کیا نا! کہ اللہ نے حکم دیا ہے"۔
"فائدہ ؟ میں نے ایک سیب اُٹھالیا۔ دوسری طرف شمیم نے کہنی ماری"۔ "ہٹاؤ بھی انھیں منھ تکنے دو۔ آؤ ہم سب کھائیں پئیں"۔ اس درمیان مس جمیلہ کہہ رہی تھیں۔
"بہن! فائدے تو بہت ہیں۔ لیکن میں اس وقت ان کی فہرست گنانا نہیں چاہتی خود رکھ کر کیوں نہ دیکھ لیجئے۔ کیا فائدہ ہے روزہ رکھنے سے"۔
"بہت اچھا سرکار"۔ ایک طرف سے اختر چہکی مس جمیلہ کے آنے کا وہ پہلا دن تھا۔ خیر ہم نے زیادہ بے تکلفی کا اظہار نہیں کیا۔ ہم سب کھا پی رہے تھے مس جمیلہ اُٹھ کر ظہر کی نماز پڑھنے لگیں۔
"کس قدر خشک زندگی ہے اس کی"۔
"بے شک! انگریزی تعلیم حاصل کر کے بھی ملانی ہی رہی"۔
"ارے اسے کوئی داڑھی والا ملا پسند آگیا ہوگا۔ تبھی تو !"
"کسی ایسے ویسے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے"۔
یہ اور ایسی ہی باتیں ہم سب کرتی رہیں۔ ادھر ہم سب فارغ ہوئے ادھر مس جمیلہ

جن کو اللہ سے واسطہ پڑا تھا۔ نماز سے نبٹ کر آ گئیں۔ پھر ہم نے زیادہ باتیں نہیں کیں انٹرول ختم ہو چکا تھا۔ اپنے اپنے درجوں میں چلی گئیں۔

ٹائم پورا کرنے کے بعد مس جمیلہ بڑے تپاک سے ملیں میں بجھی بجھی سی رہی اور بڑی دل سے للّو پتّو کر کے گھر چلی آئی مجھے قلق اپنے بیس روپوں کا تھا کہ بے کار ہو گئے۔

رات کو جب سونے لیٹی تو وہ بیس روپے یاد آتے رہے۔ ہم سب کی تفریحیں اور مس جمیلہ کی وہ خشک زندگی اور پھر ایک ایک کر کے وہ ساری باتیں بھی جو ہم سب نے انٹرول میں کی تھیں۔ ساتھ ہی مس جمیلہ کا وہ جملہ کہ روزہ رکھ کر خود دیکھ لیجئے کیا فائدہ ہوتا ہے۔

"اونھ دیکھتی تو ہوں امی کو۔ ہلکان ہو جاتی ہیں۔ میں بھوکوں کیوں مروں" میں سوچتے سوچتے جھنجھلا گئی۔ میں نے ایک طرف کروٹ لے لی۔ لیکن ہائے وہ بیس روپے، نہ جانے کیوں کھل رہے تھے، میں نے پارٹیوں میں سو سو خرچ کئے۔ لیکن وہ کبھی نہ یاد آئے اس لئے کہ وہ نیگ سے لگے تھے نا! اور بیس روپے ضائع ہو گئے۔

"بہن! روزہ رکھ کر دیکھ لو نہ! ایسا معلوم ہوا جیسے مس جمیلہ کی آواز آئی میں نے مڑ کر دیکھا کوئی نہ تھا۔ میرے کان بج رہے تھے۔ میں نے بُرا سا منہ بنایا" اس جمیلہ کو ٹھیک کرنا ہے میں نے دل میں کہا۔" کل جھوٹ موٹ کہہ دوں گی کہ روزے سے ہوں، اختر پروین لیلیٰ وغیرہ تو میرا پارٹ سمجھ جائیں گی۔ انھیں لُطف بھی آئے گا لیکن اس جمیلہ سے پوچھنا ہے کہ لے دیکھ کیا فائدہ ہے۔"

میں لیٹے لیٹے مسکرانے لگی۔ کچھ سوچ کر اُٹھی کھنکھار کر امی کے کمرے میں گئی۔ وہ نماز

پڑھ رہی تھیں۔ سلام پھیر کر مجھے دیکھا۔ پوچھنے لگیں "۔ کیا بات ہے ؟"

" امی روزہ رکھ کر کیا کرتے ہیں ؟" میں نے سوال کیا میرا خیال تھا کہ تھیوری امی سے پوچھ لوں تاکہ جمیلہ کو چڑانے کے لئے پورا پارٹ ادا کرسکوں۔

" کرتے کیا ہیں بیٹی ! امی نے بتانا شروع کیا۔ صبح ہونے سے پہلے سحری کھاتے ہیں پھر دن بھر کچھ نہیں کھاتے پیتے بُری باتیں نہیں کرتے۔ کوئی کچھ کہے تو صبر کرتے ہیں۔ غریبوں سے ہمدردی کرتے ہیں۔ بس یہی روزہ ہے"۔

" شب بخیر!" کہہ کر میں چلی گئی۔ یہ سب، تو کھاپی کر بھی ہوسکتا ہے۔ میں دل ہی دل میں دوسرے دن کے لئے کہانی سوچنے اور ڈائی لاگ تیار کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد امی میرے کمرے میں آئیں۔ پوچھنے لگیں "بیٹی ! کیا کل روزہ رکھنے کا خیال ہے۔ اللہ تجھ کو ہمت دے"۔

میں نے رواداری میں جواب دیا "جی" اور وہ خوش ہو کر چلی گئیں اور میں مسکرادی اور پھر نہ جانے کب سو گئی۔

" ایک فائدہ تو یہی ہوا کہ صبح سے کچھ نہ کر سکی " میں چونک پڑی۔

" بیٹی ! کیا خواب دیکھ رہی ہو۔ اُٹھو سحری کھالو، امی مجھے جگا رہی تھیں۔

" کیوں کھالوں ؟"

" سحری کا وقت ہو گیا ہے بیٹی !"

" تو میں کیا کروں ؟"

"تم نے کہا تھا بیٹی، روزہ رکھنے کو۔"

"چھوڑئیے بھی۔ میں کہاں روزہ رکھنے کی۔"

"بیٹی! میں نے تیرے لئے سیب کا مربّہ بنایا ہے۔ تونے کہا تھا۔ تو کھالے سحری۔"

"سیب کا مربّہ! میں جھٹ اُٹھ بیٹھی میں نے محسوس کیا۔ اس دن امی نہیں اس وقت رات میں امی بہت خوش تھیں۔ واری جا رہی تھیں مجھ پر۔ اللہ تجھ کو ہمّت دے، کیسی نیک ہے میری بچّی! اللہ تجھے نیکی عطا فرمائے!"

"چھوڑئیے امی یہ باتیں، مجھے مربّہ دیجئے۔"

"لے بیٹی! پہلے مچھلی کے کباب کھالے۔ میں نے رات میں جان مار کر تیار کئے ہیں تیرے لئے۔"

"میرے لئے امی!" میں مسکرا دی اور کھانے لگی۔

"اہا ہا، بڑے مزے کے ہیں۔"

اور پھر اس رات امّی نے بڑی عجیب عجیب نعمتیں کھلائیں۔ کھاپی چکی تو چاہا کہ پھر سو جاؤں لیکن امی نے کہا "بیٹی! روزہ رکھا ہے تو اب ذرا دیر میں اذان ہونے والی ہے۔ وضو کر کے نماز پڑھ لے، پھر سو جانا۔"

جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ کہدوں کہ "امی چھوڑئیے" مگر انگریزی تعلیم حاصل کر کے بہر حال تہذیب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ امی نے نعمتیں کھلائی تھیں، ان کا احسان تھا۔" خدا کو نہیں، امی کو خوش کرنے کے لئے نماز پڑھ لی اور پڑھ کیا لی، بس اُٹھ بیٹھ لی۔ آتی ہی

کب تھی مجھے نماز۔ اس کے بعد پھر سو گئی۔

سو کر اُٹھی تو دل نے چاہا کہ چائے پی لوں مگر امی جو تھیں گھر میں۔ والد صاحب نے جن کو میں پاپا کہتی تھی، بلایا بھی کہ پروین! چائے نہیں پیو گی؟

"میں روزے سے ہوں"

میرا یہ کہنا کہ پاپا نے اور زیرے بھائی بہنوں نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا میں بھی ہنسنے لگی۔

"آپا جان! کیا کالج میں کوئی ڈرامہ ہے اور تم اس میں روزہ دار کا پارٹ کرو گی" میری بہن انور نے پوچھا اور پھر سب ہنس پڑے۔

غرض کہ اس طرح سب نے مجھے خوب بنایا۔ سچ جو پوچھو۔ روزے کی میری نیت بھی نہ تھی۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ امی کے دل کو دُکھ نہ ہو۔ میں ہوٹل پر چائے پی لوں گی۔ بس اسی لئے اڑی رہی۔

"تو کیا واقعی تو روزے سے ہے؟" پاپا نے پوچھا۔

"بالکل!" میں مسکرانے لگی۔

آخر ماں پہ گئی نا! پاپا نے کہا اور چائے پینے لگے۔

میں نے دل میں کہا کہ، یہ کیا آفت مول لے لی۔ کالج کا وقت آیا تو پاپا نے کہا "چل! میں اپنی کار پر تجھے چھوڑ آؤں" میں کار پر ان کے ساتھ چلی۔ راستے میں پاپا بولے" ہوٹل میں کچھ کھا پی لے" میں نے انکار کر دیا۔ انکار اس لئے نہیں کہ میں واقعی روزے سے ہوں۔

بلکہ اس لئے کہ جب پاپا سے کہہ دیا ہے تو آن رہ جائے۔ انٹرول تک تو بھوک لگتی نہیں ہے انٹرول میں کھا پی لوں گی۔

انٹرول تک واقعی بھوک پیاس نہ لگی۔ خوب تر مال کھلا دیا تھا امّی نے، انٹرول میں پیٹ کچھ مانگنے لگا اور عمر میں پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ پیٹ کی اس مانگ کا نام بھوک ہے۔ اختر نے پوچھا "اس وقت ٹھنڈی کیوں ہو رہی ہو۔ خیریت ہے۔"

"آج میں روزے سے ہوں۔"

وہی قہقہہ جو گھر میں بلند ہوا تھا وہی یہاں بھی بلند ہوا۔ سمجھ تو سب گئی تھیں۔ پروین ڈرامہ کر رہی ہے لیکن مس جمیلہ نے کہا "جزاک اللہ!" اور پھر جب وہ نماز پڑھنے چلیں تو کہنے لگیں "بہن روزہ رکھا ہے تو آؤ نماز بھی پڑھ لو۔"

نہ جانے میں کیوں نماز پڑھنے چلی گئی۔ میری اس حرکت سے سب کا خیال تھا کہ اب مس جمیلہ کی درگت ہونے والی ہے۔ مگر میں اٹھک بیٹھک کر کے چپکی چلی آئی۔ بات یہ تھی کہ اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اختر، شمیم اور شائستہ کو اشارہ کیا اور سب کو ساتھ لے کر چلی۔ مس جمیلہ دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئیں۔ ارادہ تھا کہ جمیلہ صاحبہ کی عدم موجودگی میں کچھ کھا پی لوں راستے میں آواز سنی "بھگوان بھلا کرے۔" دیکھا تو عمر میں پہلی بار دل میں نرمی محسوس ہوئی۔ ایک بھکارن اپنے بچے کو گود میں لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھی۔ میرا ہاتھ غیر شعوری طور پر منی بیگ پر جا پڑا۔ میں نے کھولا اور جو ہاتھ میں آیا نکال کر اس عورت کو دے دیا۔ میری سہیلیاں حیرت زدہ ہو کر رہ گئیں۔

"یہ کیا کیا تم نے! تو کیا اس وقت صرف چائے پر ٹالو گی؟"

"چائے بھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"آج میرا روزہ ہے۔"

"اس سے فائدہ؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔"

"تو کیا خود بھوکی رہو گی؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"ایک بھوکے کا پیٹ بھرنے کے لئے۔"

اور میں پلٹ پڑی۔ سہیلیاں جو سب کی سب ٹیچر تھیں۔ دنگ ہو کر رہ گئیں۔

"واہ ہم تو سمجھے تھے، یہ ڈرامہ ہو رہا ہے، مگر........"

"مگر اب میں سچ مچ روزے سے ہوں۔"

میں واپس آگئی۔ مس جمیلہ نے پوچھا "کہاں گئی تھیں اور اتنی جلد کیوں واپس آگئیں"۔

"انٹرختم ہونے والا ہے جو۔"

اور واقعی مجھے ایک سوال کا جواب مل گیا۔ آپ سے آپ حل گیا۔ "روزہ بھوکوں سے ہمدردی کے لئے رکھا جاتا ہے۔ میری زبان سے آواز کے ساتھ نکل گیا۔"

"بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ مواسات کا مہینہ ہے۔" یہ مس جمیلہ کی آواز تھی، اب سوچتی ہوں کہ میں نے دوپہر کے بعد روزے کی نیت کی تھی۔ روزہ تو وہ ہوا نہ ہوگا، لیکن وہ روزہ میرا روزوں کی تمہید بن گیا۔ ارادہ کرلیا تو نہ جانے کہاں سے صبر آگیا۔ ہر روز کی دروغ آمیز گفتگو سے میری ٹیچر دوست اس دن محروم رہ گئیں۔

شدہ شدہ یہ خبر پرنسپل صاحبہ کو ہوئی۔ مسز کملاوتی ایک پُرانی اور دیندار خاتون تھیں انھوں نے مجھے بلایا۔ حال پوچھا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ ہاں میں روزے سے ہوں وہ سُن کر بہت خوش ہوئیں۔ بولیں۔

"مس پروین، مذہب کے بغیر کوئی انسان، انسان نہیں بن سکتا۔ وہ بھگوان کا بھجے ہی ہے جو انسان کو بُرائیوں سے روک سکتا ہے اور جہاں تک میرا مطالعہ ہے میں کہہ سکتی ہوں کہ اسلام نے انسانیت کو سنوارنے کے لئے بہترین اصول دئے ہیں۔

پرنسپل صاحبہ نے پہلی بار مجھ سے اس طرح کی باتیں کی تھیں۔ میں نے اس دن سنجیدہ اور غیر سنجیدہ اعزاز میں نمایاں فرق محسوس کیا، لیکن شام ہوتے ہوتے میرا بُرا حال ہوگیا۔

عصر کے وقت گھر پہنچی تو نہ جانے بُوا نے کیا کہا۔ اور میں ان پر برس پڑی۔ امی دوڑ کر آئیں، بیٹی! یہ صبر کا منہ ہے اور صبر کے معنی ہیں بُری باتوں، غصہ اور جھوٹ کے مقابلے پر نیکی پر جمے رہنا۔

"صبر کے معنی تو مجبوری کے ہیں امّی!"

"بیٹی! یہ اُردو میں غلط معنی میں بولنے لگے ہیں۔ ورنہ عربی میں یہی ہیں جو میں نے کہے"
اس دن مجھے معلوم ہوا کہ امیؔ محض اَن پڑھ نہیں ہیں اور میرے دل میں ان کی عظمت بیٹھ گئی۔ پھر شام تک مجھے بات بات پر غصہ آیا۔ لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر کا انسان جو سویا پڑا تھا، جاگ رہا ہے۔

مغرب کے وقت جب میں نے روزہ کھولا۔ تو وہ پہلا گھونٹ جو میں نے پیا، اس کی لذت عمر بھر نہ بھولوں گی۔ جنت کی کیفیتوں کا نام میں نے سنا تھا کوثر و تسنیم کا مزہ شاید ایسا ہی ہو۔ میں نے امی سے پہلے گھونٹ کی لذت اور پھر اس سے جو شگفتگی حاصل ہوئی تھی اس کا حال کہا تو بولیں۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے"۔ مجھے حضورؐ کے پورے الفاظ تو یاد نہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ روزہ دار کو دو ایسی نعمتیں حاصل ہوں گی کہ ان سے بڑھ کر دوسری نعمتیں نہیں ہوسکتیں۔ اس دنیا میں روزہ کھولنے کے وقت پہلے گھونٹ کی لذت اور آخرت میں اللہ کا دیدار۔

"سچ ہے امیؔ!" میری زبان سے نکلا تھا۔ اور وہ دن ہے اور آج کا دن ہے اب میں (دعوٰی تو نہیں) لیکن فخر ضرور ہے کہ میں واقعی ایک مسلمان ہوں اور کیا عرض کروں بڑی لمبی داستان ہے پھر زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا پاپا (والد صاحب) اور میرے بھائی اور میری بہنیں سب اسلام کے سانچے میں ڈھل گئے اگر فرصت ملی تو انشاء اللہ یہ داستان بھی ایک دن سناؤں گی۔

اوّل انعام

نصرت چائے لے کر کمرے میں آئی تو دیکھا، ابا جان اسی طرح سر جھکائے اُداس بیٹھے ہیں اس کا ننھا سا دل کانپ اُٹھا۔ اس نے ہمّت کر کے پھر ایک بار پوچھا " ابا جان امی ٹھیک ہیں نا!"

"کہہ تو دیا بھنّو! ٹھیک ہیں۔ ویسے آج ہی تو آپریشن ہوا ہے۔ اتنی جلد کیسے اچھی ہو جائیں گی!"

"پھر آپ اس قدر رنجیدہ کیوں ہیں۔ کھانا بھی نہیں کھایا آپ نے ؟"

"تھک گیا ہوں بیٹی! رات بھر ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔" پھر اچانک تعجب کرتے ہوئے بولے۔" ارے تو چائے کے ساتھ یہ جانے کیا لے آئی!"

"آپ صبح سے بھوکے جو ہیں۔" نصرت نے کیتلی اُٹھاتے ہوئے اور پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔" یہ سب کھانا ہو گا ابا جان! کھیے دیتی ہوں!" نصرت کے چہرے پر ذرا خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"توبہ ہے!" چائے کی پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے ابا جان مسکرا دیئے۔ ایک ہی دن میں

اپنی امی کی طرح رعب جمانا سیکھ گئی تو۔"

ابا جان کی بات سے نصرت کو ہنسی آگئی۔ لیکن پھر اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"ہش پگلی! روتی کیوں ہے؟ کہا تو آپریشن کامیاب ہوا ہے، اچھا تو یہ کرایہ کچھ انجکشن اور دوائیاں نرسنگ ہوم میں دے آ۔ میں ذرا سو لوں"۔ ابا جان نے نصرت کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ "تو اپنی امی کو خود دیکھ آ، مگر دیکھ وہاں زیادہ باتیں نہ کرنا اور نہ رونا، سمجھی۔"

"اچھا ابا جان! نصرت بہت خوش ہوئی۔ وہ چاہتی بھی تھی کہ امی جان کو ایک نظر دیکھ لے۔ وہ کئی دن سے اپنی پیاری امی جان کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھی۔ وہ آخری بار جب اپنی امی جان کو دیکھ کر آئی تھی تو اس وقت امی تھیں تو بہت کمزور لیکن اس کو دکھانے کے لئے بڑی بہادر بن گئی تھیں۔" اری سست کیوں ہے؟ آپریشن تو یوں چٹکی بجاتے ہو جاتا ہے۔ اس میں تکلیف تھوڑی ہی ہوتی ہے۔" وہ کہہ تو یہ رہی تھیں لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے امی جان رو پڑنے کو ہیں۔ نصرت کو ایسا ہی لگا تھا مگر اس نے بھی ضبط سے کام لیا تھا رات کو جب پڑوس کی منہ بولی پھوپی اس کے پاس سونے آئیں تو انھوں نے اس کی تعریف کی۔" نصرت تو بڑی اچھی بیٹی ہے۔ اپنے والدین کے دُکھ اور درد کو سمجھتی ہے!"

تیار ہو کر جب وہ اباجان سے کرایہ کے پیسے لینے آئی تو دیکھا کہ ابا جان سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اس نے بڑی احتیاط سے انجکشن اور دوائیاں کنڈیا میں رکھیں پھر سوچنے لگی کہ پیسے ابا جان سے مانگوں یا ان کے کوٹ کی جیب سے

خود نکال لوں۔ اس نے ابا جان کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ کوٹ کی طرف بڑھی اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ جیب سے آر پار نکل گیا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔"

"اوئی اللہ! کٹی ہوئی ہے یہ تو!" وہ بدحواس ہو کر سونے کے کمرے کی طرف بھاگی! اسے دیکھ کر ابا جان نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ نصرت پلنگ پر بیٹھ گئی اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔

"تو آپ کو معلوم تھا آپ کو ابا جان! آپ کو کب معلوم ہوا کہ جیب کٹ گئی۔ کتنے روپیہ تھے بیگ میں اور کیا تھا جیب میں"۔ اس طرح سوالوں کی بوچھار کرتی ہوئی وہ رونے لگی۔ وہ رونے کے لئے بہانہ بھی ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے موقع مل گیا۔

ابا جان اُٹھ بیٹھے" تو روتی کیوں ہے کیا رونے سے رقم واپس مل جائے گی؟"

"تو پھر آپ کچھ بتاتے کیوں نہیں"۔ وہ اپنی آنکھیں ملنے لگی۔

"پیاری بیٹی! میں تیرے ننھے سے دل کو دُکھانا نہیں چاہتا تھا۔ چوٹ کھا کر تھوڑی دیر میں بھی ہکّا بکّا رہ گیا تھا۔ دو سو روپئے تھے بیٹی! کل ہی تو تنخواہ ملی تھی۔ کل کے انتظار میں آپریشن ملتوی رہا تھا بیٹی! اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ ہمارے لئے یہ رقم بہت بڑی تھی!" تو اب کیا ہوگا ابا جان!" نصرت ہمک کر رہ گئی۔" جو اللہ چاہے گا بیٹی! آزمائش کہہ کر نہیں آتی مالک کی مصلحت اسی میں کچھ ہو گی مگر تو کیوں روتی ہے"۔

"مگر اب خرچ کیسے چلے گا۔ امی کی دوائیاں کہاں سے آئیں گی؟ ابا جان آپ یہ میری

بالیاں لے جائیے۔"

"کیوں؟ پگلی! تو کیوں فکر کرتی ہے جس نے یہ اُفتاد ڈالی ہے، وہ خود کچھ کرے گا انجکشن اور دوائیاں تو میں لے ہی آیا۔ یہ دو سو تو میں نے اس لئے بچائے تھے کہ تیری رشیدہ پھوپی کو بُلوالوں گا۔ رشیدہ کے ساتھ دو بچے بھی ہیں۔ سوچا تھا کہ ایک ایک جوڑا ان کے لئے بھی بنوا دوں گا۔ رشیدہ آ کر گھر کا انتظام سنبھال لیتی تیرا پڑھنے کا ہرج نہ ہوتا۔ اب دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے۔ اللہ کے سوا اب کوئی سہارا بھی تو نہیں قرض مل سکتا ہے۔ مگر میں قرض لینا نہیں چاہتا۔

نصرت نے ایک لمبی سانس بھری۔ وہ اٹھی جاکر اپنی بکسیا کھولی۔ اس میں ڈیڑھ روپیہ ملا۔ اس نے لیا اور ابّا جان کو سلام کر کے جانے لگی۔

"دیکھ بنّو! امی سے کچھ نہ کہنا۔" اباجان نے تاکید کی۔

"جی اچھا اباجان!"

راستے میں نہ جانے وہ کیا سوچتی رہی۔ چھوٹے بھائی سعید کو اس نے رکشا پر ساتھ بٹھا لیا تھا۔ اس نے ایک جگہ سنترے دیکھے تو اپنی آپیا کی طرف دیکھنے لگا۔ نصرت سمجھ گئی۔ اس نے رکشا رُکوایا۔ ایک سنترہ خرید کر سعید کو تھما دیا اور پھر اپنے خیالات میں کھو گئی۔ "امی کی بیماری ہی کیا کم تھی کہ اوپر سے اباجان پر یہ افتاد پڑ گئی۔ اباجان کے دل پر نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی وہ اسی طرح سوچتی ہوئی اسپتال کے احاطے میں داخل ہوگئی رکشا رکی۔ اس نے رکشا کے پیسے دئے اور کنڈیا اور سعید کو ساتھ لیکر نرسنگ ہوم کی طرف چل دی۔

اپنی امی کا سفید چہرہ دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ مار کر رو دے۔ لیکن اس نے اپنے کو سنبھال لیا۔ امی اس وقت سو رہی تھیں، ننھی نصرت نے بڑی سمجھداری سے کام لیا اس نے جگایا نہیں۔ نرس کو سامان دے کر باہر نکلی تو اس کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی تھیں۔ سعید نے پوچھا" اپیا تم روتی کیوں ہو؟" اس کا جواب اس نے کچھ نہ دیا۔ چپکے رکشا پر بیٹھی اور گھر کی طرف چل دی۔ رکشا والا ایک بوڑھا سا آدمی تھا اس نے سمجھایا" بھنو اللہ کو یاد کرو آپریشن سے خطرہ نہیں ہوتا۔ تمہارے گھر کوئی بڑا بوڑھا نہیں۔ تم اکیلی کیوں آئیں؟"

رکشا والے سے یہ سنا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گھر میں اکیلے ابا ہیں۔ وہ رات بھر کے جاگے تھے۔ میں دوائیں لے کر آئی تھی۔"

"اچھا اچھا بڑی اچھی بیٹی ہے تو۔ کھانا کون پکاتا ہے؟ رکشا والے نے پوچھا۔

"امی جان!"

"امی جان! امی جان تو یہاں ہیں بھولی بھنّو!" اور اب نصرت اپنے جواب کی غلطی سمجھی اس نے بتایا کہ ابا جان، پھوپی جان کو آج لے آئیں گے۔

"اور بیٹی! تم نے کچھ نہیں سیکھا؟ رکشا والے نے سوال کر دیا۔ اور نصرت کے لئے سوچنے سمجھنے کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔" کچھ کچھ کر لیتی ہوں۔ مگر میں بچیوں کے مدرسہ میں پڑھتی ہوں۔ امتحان کے چار مہینے باقی ہیں۔ نصرت کہنے کو تو کہہ گئی لیکن اس کے جواب سے رکشا والا مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پھر کہا:۔

"بیٹی پڑھنا لکھنا تو پھر ہو جائے اس وقت تو ــــ!" پھر نہ جانے وہ کیا سوچ کر

خاموش ہو گیا۔ سامنے ایک کار آ رہی تھی۔ اس نے رکشا کو اس سے بچایا اور بائیں طرف ہو لیا تھوڑی دیر میں گھر آ گیا۔ نصرت بھائی کو لے کر گھر آ گئی۔ ابا جان سو رہے تھے۔ سعید تو اپنی گیند لے کر باہر نکل گیا۔ نصرت چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔

"ابا جان ہماری دیکھ بھال کے لئے رشیدہ پھوپی کو بلائیں گے۔ پھر پھوپی جان کے ساتھ دو بچے بھی آئیں گے ہاں مجھے آرام تو ملے گا۔ بچوں میں میرا دل بھی بہلے گا مگر ایک بات یہ بھی ہے۔ ان کے دونوں بچے بڑے شیطان ہیں وہ تو گھر کو کباڑیے کی دوکان بنا دیں گے۔ ہم کچھ بولیں گے تو پھوپی جان کو بُرا لگے گا وہ تو احسان کرنے آئیں گی اور یہاں ہم ان کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ان کے آنے سے میرا اسکول کا ہرج نہ ہوگا۔ مگر میرا دل تو گھر میں لگا رہے گا۔ نہ جانے جلال اور اکبر کس کس چیز کا ستیاناس کر دیں۔ پھر جب میں اسکول سے آ کر ہوم ورک کروں گی تو ان کی چیخ پکار میں پڑھ ہی کیا سکوں گی۔" نصرت لیٹ گئی لیٹے لیٹے سوچنے لگی۔

کیوں نہ احمدی بُوا کو پندرہ دن کے لئے ابا جان رکھ لیں۔ ان کے ساتھ بچوں کی کوئی پلٹن بھی نہیں ہے عادت کی بھی اچھی ہیں مگر ان میں عیب یہ ہے کہ وہ موٹی بہت ہیں۔ چاء بنائیں گی، کھانا پکائیں گی تو مجھے خوب نچائیں گی۔ پڑھنے وہ بھی نہ دیں گی ذرا بھنّو دیا سلائی دینا، ذرا پانی تو لا، وہ ہنڈیا دھو دے اور یہی کہہ کر سارا کام مجھ سے لے لیں گی۔ خود پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے حکم چلائیں گی۔ مگر پھر جب کسی کو نہ بلایا گیا تو گھر کا کیا بنے گا اور میری تعلیم؟ کیا ابا جان اپنے ہاتھ سے چولہا پھونکیں گے؟ معلوم تو یہی ہوتا ہے

کیونکہ ان کے پاس نہ تو پھوپی جان کے جوڑوں کے لئے رقم رہ گئی اور نہ احمدی بُوا کو تنخواہ دینے کے لئے روپے ہی ہیں۔ کیا کریں گے ابا جان ؟" نصرت کچھ فیصلہ نہ کر سکی۔

اسی وقت ابا جان کھنکھار رہے۔ نصرت چارپائی پر اُٹھ بیٹھی۔" ابا جان آپ نہائیں گے" اس کی زبان سے برجستہ نکل گیا۔ وہ جھٹ باورچی خانے میں گئی۔ چولھے میں لکڑیاں لگائیں۔ لکڑیوں کے نیچے کچھ کاغذ رکھے اور دیا سلائیوں پر دیا سلائیاں جلا کر آگ جلانے لگی۔ ابا جان کمرے سے باہر آ چکے تھے انھوں نے بھی مدد دی۔ آگ جل گئی وہ لوٹا لے کر رفع حاجت کے لئے چلے گئے۔ نصرت کا خیال تھا کہ ابا جان تیتڑا بھر کر چولھے پر رکھ دیں گے مگر شاید انھیں خیال نہیں رہا۔ اب نصرت کیا کرے۔ اس نے ایک تدبیر کی۔ خالی تیتڑا چولھے پر رکھ دیا اور نل سے لوٹوں میں پانی بھر بھر کر تیتڑے میں انڈیلنے لگی اس طرح اس نے تیتڑا بھر دیا اپنی اس کامیابی پر وہ بہت خوش ہوئی۔

ادھر پانی گرم ہو رہا تھا۔ ادھر نصرت نے غسل خانے میں تولیہ اور صابون وغیرہ رکھ دیا۔ ابا جان واپس آئے تو بہت خوش ہوئے۔ تیتڑا کس نے رکھا ہے بیٹی ؟"

" میں نے "

" تجھ سے کیسے اُٹھا یہ ؟"

نصرت نے اپنی تدبیر بتائی تو ابا جان نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔" شاباش بڑی سمجھدار اور ہوشیار ہے میری بیٹی ! اور پھر انھوں نے تیتڑا اُٹھا کر غسل خانے میں رکھ دیا کواڑ بند کر کے نہانے لگے۔ نصرت نے چائے کے لئے پانی رکھ دیا۔ ابا جان کے آتے آتے

اس نے چائے تیار کر لی جیسے ہی ابا جان آ کر بیٹھے اس نے ٹرے ان کے آگے رکھ دیا۔

"سعید کہاں ہے؟" ابا جان نے پوچھا۔

"گیند لے کر باہر گیا تھا ابھی تک نہیں آیا۔ بلاتی ہوں۔" نصرت آواز دینے والی ہی تھی کہ سعید پانی میں لت پت گھر میں آیا اس نے روتے ہوئے حمید کی شکایت کی کہ اس نے بھگو دیا۔ نصرت لپکی اس نے اس کے کپڑے اتروا کر نل کے نیچے ڈال دئے اور دوسرے کپڑے پہنا دئے پھر میلے کپڑے کھنگال کر تار پر پھیلا دئے۔ ابا جان یہ سب دیکھ رہے تھے۔ وہ چائے پیتے رہے اور دیکھتے رہے، چائے پی کر بولے۔" نصرت! تو چائے نہیں پئے گی کیا؟"

"پی لوں گی ابا جان!" اس نے سعید کی بوشرٹ تار پر ٹانگتے ہوئے کہا اور پھر جھٹ ابا جان کے پاس آ گئی۔ سعید کو پکارا اسے ایک بسکٹ دیا۔ تعجب ہے کہ اس نے دوسرے بسکٹ کے لئے ضد نہیں کی اور جتنی چائے نصرت نے دی۔ اتنے ہی پر صبر کر لیا۔ اس کے بعد نصرت نے ٹرے اُٹھایا۔ پیالیاں وغیرہ دھو کر دھوپ میں اُلٹ کر رکھ دیں۔ اس کی امی کا یہی طریقہ تھا۔ پھر وہ ابا جان کے پاس آ کر کہنے لگی۔

ابا جان گھر کی دیکھ بھال اور کام کاج کے لئے کسی کو بھی نہیں بلایا جائے گا میں سب کر لوں گی۔"

ابا جان کو بڑا تعجب ہوا" تو کیسے کرے گی، تیری عمر ہی کیا ہے، تیری تعلیم کا کیا ہوگا پڑھنے کا ہرج ہوگا۔ گھر کا دھندا کوئی آسان کام نہیں۔" وہ دیر تک لیکن ویکن کرتے رہے، لیکن نصرت نے اپنا فیصلہ بار بار دہرایا تو انھیں بڑا سہارا ملا پھر بھی وہ تعجب سے کہتے رہے،

"گھر کا دھندہ تیرے بس کا نہیں۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح ابا جان کو ثبوت مل گیا کہ نصرت ماں کی طرح نہیں پھر بھی جیسے تیسے ایک ماہ تک گھر کو سنبھال ہی لے گی۔ وہ نماز پڑھ کر گھر آئے ہی تھے کہ نصرت نے چائے اور ناشتہ آگے لا دھرا۔ اس کے بعد وہ کھانا پکانے بیٹھ گئی۔ اس نے سعید کو رومال میں باندھ کر پیسے دئیے کہ دوڑ کر دوکان سے آلو لے آئے۔ وہ دوڑا دوڑا گیا۔ آلو لے آیا اتنی دیر میں نصرت نے آٹا گوندھ ڈالا۔ آٹا گوندھ کر آلو کاٹے اور پھر نو بجے تک اس نے کھانا پکا لیا۔ ایک ناشتہ دان میں ابا جان کو دیا۔ ابا جان بیٹھے اپنی قمیص میں بٹن لگا رہے تھے۔ اس نے جھٹ قمیص چھین لی۔ اور بٹن لگا دیا۔ ابا جان کپڑے پہننے لگے۔ ادھر اس نے اپنے ناشتہ دان میں کھانا رکھا۔ سعید کو کپڑے پہنانے لگی تو دیکھا کہ اس کا پاجامہ پھٹا ہے مشین پر جا کر سی دیا۔ اس کے بعد ابا جان اسپتال گئے۔ نصرت سعید کو لے کر بچیوں کے مدرسہ کو پیدل چل دی۔ مدرسہ پہنچی تو وہاں اُستانی نے ہوم ورک دیکھنا شروع کر دیا تو نصرت کو پتہ چلا کہ ہوم ورک تو رہ ہی گیا۔

"یہ تم نے آج کیا کیا؟" اُستانی نے نصرت کو ڈانٹا۔ اس ڈانٹ پر نصرت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔"

"آپا صاحب! میری امی بیمار ہیں۔" اس کی زبان سے نکلا۔ اُستانی نے پھر کچھ نہ کہا تیسرے گھنٹے میں سعید آپ سے آپ رونے لگا۔ تو حساب کی استانی نے نصرت کو گھور کر دیکھا "اسے کیوں ساتھ لائی ہے؟" نصرت نے استانی کے گھورنے کا کوئی خیال نہیں کیا — وہ

جھپٹ کر سعید کے پاس گئی۔ وہ اس وقت صحن میں کھڑا تھا۔ اس کا پیشاب خطا ہو گیا تھا نصرت نے پائے جامہ اُتار کر نل سے کھنگالا اور دھوپ میں ڈال دیا۔ سعید پھر کھیلنے لگا، نصرت پلٹ کر کمرے میں گئی تو حساب کا گھنٹہ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے پاس بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے پوچھا کتنے سوال ہوم ورک کے لئے دئے گئے۔ اس نے ریاضی کی کتاب کا صفحہ بتا دیا۔

نصرت نے مدرسے کے کام کے ساتھ سعید کو سنبھالا اُستانیوں کی ڈانٹ سہی وہ سمجھتی تھی کہ یہ ڈانٹ دس بارہ دن تک رہے گی۔ پھر امی گھر آ جائیں گی۔ پھر وہ کچھ سوچ کر پرنسپل صاحبہ کے پاس گئی۔ ان سے گھر کا سارا کچا چٹھا کہہ سنایا۔ پرنسپل صاحبہ نے اُستانیوں کو بتایا اور اُستانیاں اپنی اپنی جگہ نرم پڑ گئیں۔

چھٹی کے بعد جب وہ گھر چلی تو کھانے پینے کا وہ سامان جو ترکاری اور گوشت سے متعلق تھا ساتھ لیتی گئی۔ گھر پر اس کے ابا آ چکے تھے انھوں نے پیدل دیکھا تو ٹوکا لیکن انھیں اطمینان دلا دیا کہ مدرسہ ہے ہی کتنی دور۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جن کو وہ پی گئے۔"

"بیٹی! تیری امی آج بہت اچھی ہیں۔ اور نصرت یہ سن کر اتنا خوش ہوئی کہ کبھی کاہے کو خوش ہوئی تھی۔ گھر میں جب اس نے بستہ رکھا تو اسے یاد آیا کہ برتن نل کے نیچے جوٹھے ہی پڑے ہیں اور چولھے میں راکھ بھری کی بھری ہے۔ وہ چولھے کے کام میں جٹ گئی ابا جان نے چاہا کہ کچھ ہاتھ بٹائیں تو ان سے کہہ دیا" ابا جان! آپ اسپتال پھر ایک بار ہو آئیے۔"

"سب ٹھیک ہے بیٹی" ابا جان نے اطمینان دلایا۔

"اور امی کو پھل کا رس، اور دودھ وغیرہ ـــ" اس نے برتن دھوتے ہوئے کہا۔
"وہ سب ہو جائے گا۔ لاؤ میں پانی چولھے پر رکھ دوں۔ پہلے سب چائے پی لیں"
"نہیں اباجان! آپ ذرا دیر آرام کر لیں۔ میں سب کر لوں گی"

اور یہ کہہ کر اس نے چائے بنائی۔ چائے پیتے وقت سعید مچل گیا کہ میٹھے چاول کھائے گا اسے بہت سمجھایا کہ اس وقت صرف چائے ہی پیتے ہیں مگر وہ نہ مانا۔ اس سے وعدہ کیا گیا اور جب اسے بسکٹ دیا گیا تو مانا۔ چائے پیتے پیتے نصرت نے سوچا۔ چلو آج میٹھے چاول ہی پکا لوں، صبح کی ترکاری رکھی ہے۔ کچھ روٹیاں اور ڈال لوں گی۔ اس نے دیگچی میں پانی اور شکر ملا کر اُسے چولھے پر چڑھا دیا۔ پھر چاول دھو کر ڈال دیئے اور آٹا گوندھنے لگی۔ چاولوں میں اُبال آیا۔ پھر وہ کھد بد کھد بد پکنے لگے اس نے کنی دیکھی تو پورا پورا چاول ویسے کا ویسا ہی رکھا تھا۔ ناتجربہ کار نصرت نے یہ سمجھا کہ پانی کم رہ گیا، اس لئے نہیں گلے۔ اس نے تھوڑا پانی ڈال کر ڈھانک دیا۔ پھر چولھے کی انگیٹھی کی طرف دیگچی کر کے روٹیاں پکانے لگی۔ وہ روٹیاں پکا چکی تو پھر چاول دیکھے، وہ ویسے کے ویسے کچے تھے۔ اب اس نے اباجان کو دیکھا۔ وہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ نصرت کھڑکی سے ہو کر پڑوسن کے گھر گئی۔ "مجیدہ پھوپی چاول تو گلے ہی نہیں!"

مجیدہ پھوپی اس کے ساتھ آئیں۔ دیگچی کا ڈھکنا ہٹا کر دیکھا۔ "اری تو نے کیسے چڑھایا یہ سب ؟"

"چاول اور شکر ایک ساتھ" نصرت نے جواب دیا۔ "اس کے بعد چاول ڈال دیئے

"تو بہ قیامت تک نہیں پکیں گے۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ شکر اور چاول لائیں پکا کر دکھا دوں گی۔" مجیدہ پھوپھی نے آدھ گھنٹہ ٹھہر کر میٹھے چاول پکانا سکھائے۔ اباجان کو معلوم ہوا تو وہ مسکرائے بھی اور رنجیدہ بھی ہوئے مجیدہ پھوپھی کے جانے کے بعد نصرت نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا پھر برتن دھوئے۔ پھر راکھ نکال کر ایک طرف رکھی۔ پھر بستر لگائے اور رموم ورک لے کر بیٹھ گئی اباجان اپنے پلنگ پر لیٹے۔ انھوں نے کروٹ دوسری طرف لے لی۔ لیکن وہ رو رہے تھے۔ یہ بات نصرت کو اس وقت معلوم ہوئی جب اس نے "ربط ضبط" کے معنی پوچھے اور اباجان نے ادھر دیکھا۔

"ہائے اللہ! آپ تو رو رہے ہیں اباجان، امی کیسی ہیں سچ بتائیے"۔

"بیٹی وہ تو اچھی ہیں لیکن تجھے پھرکی کی طرح ناچتے دیکھ کر میرا دل بھر آیا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" نصرت نے کہنے کو کہہ تو دیا۔ لیکن اسے بھی ایسا لگا جیسے کوئی چیز دل سے اُٹھ کر حلق کی طرف گئی اور وہاں اٹک گئی۔ اس نے سر نیچا کر لیا اور پھر پڑھنے لگی۔ سعید رو یا تو ساتھ ہی اُسے تھپکنے لگی۔"

اباجان کو نصرت اس وقت ایسی اچھی لگ رہی تھی کہ وہ اُٹھے۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا" اللہ تجھے دونوں جہان میں سُرخرو کرے"۔ انھوں نے دعائیں دیں۔

گھر کے اندر کا انہماک، خدا کی پناہ، ابھی بھنگن سے نبٹی تو دھوبن سے سابقہ پڑا کبھی ،،

محلہ کی کوئی عورت کچھ مانگنے آئی کبھی سعید کے کپڑے درست کئے کبھی ابا جان کے جوتوں پر پالش کی۔ ایک بھر مجال تھا جس میں سر کھپا رہی تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ کام باقی رہ جاتا "جنے امیّ کیسے کر لیتی تھیں" ؟ اس کی زبان سے نکلا۔ گھر کے بھر مجال میں پھنس کر اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہوم ورک کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آئے دن استانیوں کی ڈانٹ پڑنے لگی۔ "نصرت! اب تم توجہ نہیں دیتی ہو۔ اپنی سیٹ کھو دو گی"

مگر نصرت کرتی تو کیا۔ اس نے ہوم ورک کا وقت عشا کے بعد مقرر کیا لیکن اس عمر کی بچی اسے نیند آنے لگتی۔ اور دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ اتنا تھک جاتی کہ جاگنے کی نیت کے باوجود وہ اونگھ جاتی اور پھر بستر پر آپ سے آپ گر کر سو جاتی۔

کامل پندرہ دن کے بعد جب امی گھر آئیں تو نصرت دبلی ہو چکی تھی اور پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اپنے سر میں تیل اس نے تین ہی بار ڈالا۔ امی جان کو اب بھی زیادہ باتوں کی اجازت نہیں تھی۔ وہ لیٹے لیٹے اپنی ننھی کو بجلی کی طرح تڑپ کر کام کرتے دیکھتیں تو آنسو بہانے لگتیں۔ بے چاری لیٹے لیٹے بٹن لگانا اور ایسے ہی کچھ چھوٹے کام وہ خود کر دیتیں اور ہدایات دے دے کر اپنے تجربات سے اس کے ذہن کو بھرنے کی کوشش کرتیں۔

خدا خدا کر کے ڈیڑھ مہینے کے بعد امی جان نے غسلِ صحت کیا۔ اس کے بعد کچھ کچھ کام وہ بھی کرنے لگتیں۔ حالانکہ نصرت اب بھی ان کو روکتی اور دوڑ دوڑ کر کام ان کے ہاتھ سے جھپٹ لیتی۔

اس طرح اپریل کا مہینہ آگیا اور اسکول میں امتحان کا چرچا ہونے لگا۔ وسط اپریل سے

امتحان شروع ہوا۔ نصرت نے امتحان دیا۔ پھر جب رزلٹ سنایا گیا تو بچیوں کے مدرسے کی فرسٹ پوزیشن کی لڑکی نصرت تھرڈ نمبر میں پاس ہوئی۔ نصرت نتیجہ سُن کر رونے لگی۔ وہ روتی ہوئی گھر آئی اور منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔ ماں نے تسلی دی۔" اری پگلی یہی بہت ہے کہ تو پاس ہو گئی۔ تجھے پڑھنے لکھنے کا موقع ہی کب ملا ہ؟"

"اوں، اوں، امّی جان! ابا جان نے سالانہ امتحان میں گھڑی دینے کا وعدہ کیا تھا"

"تو کیا ہوا محنت کر کے اگلے سال پڑھنا فرسٹ آنا اگلے سال گھڑی لے لینا۔"

اسی وقت ابا جان خوش خوش گھر آئے: "کہاں ہے میری اچھی بیٹی نصرت ؟" اور یہ کہتے ہوئے وہ نصرت کی طرف بڑھے۔ نصرت ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔" ابا جان میں تھرڈ پاس ہوئی۔"

"کون کہتا ہے تو تھرڈ پاس ہوئی تو فرسٹ پاس ہوئی۔"

"فرسٹ!" نصرت ابا جان کو دیکھنے لگی۔

"ہاں، ہاں فرسٹ! اسکول کی پڑھائی اسی لئے تو ہوتی ہے کہ طالب علم ایک اچھا انسان بنے، پیاری بیٹی تو نے ماں کی بیماری میں وہ کارنمایاں انجام دیا ہے کہ دوسرا کر نہیں سکتا تیری وجہ سے میرے سیکڑوں روپے بچ گئے تو نے اس کمسنی میں بڑی بوڑھیوں کو مات کر دیا۔"

اور یہ کہتے کہتے ابا جان نے ایک قیمتی گھڑی چم چم کرتی ہوئی جیب سے نکالی، اور نصرت کی کلائی میں باندھ دی۔

"بیٹی! اسکول میں تو تو ہمیشہ اوّل آتی رہی اللہ تعالیٰ نے اس سال ہمیں کیسے بڑے امتحان میں ڈالا۔ لیکن تیری وجہ سے ہم سب کامیاب ہوئے تو ہم سب میں اول رہی یہی تو اچھی بچیوں کی اصل کامیابی ہے۔ خدا تجھ کو گھڑی مبارک کرے۔

گھر کے سب ہی لوگ بہت خوش ہو رہے تھے۔ سعید اپنی اپیا کی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

"اپیا ذرا میرے ہاتھ میں باندھئے تو، کیسی لگے گی؟"

منّے بھائی کی کلائی میں نصرت نے گھڑی باندھ دی اور بولی۔ "میرا منا بھی تو اوّل رہا وہ ضد نہیں کرتا تھا ہے نا!" اور یہ کہہ کر نصرت نے سعید کے گال تھپتھپا دیئے۔

چیتا مار

"بالکل غلط ہے" شہاب چاچا نے اپنی گرجدار آواز نکالی اور ہم سب ان کی طرف دیکھنے لگے وہ ہمارے ساتھ پیال پر گھنے درخت کی جڑ سے ٹیک لگائے اور لحاف اوڑھے بیٹھے تھے۔ وہ ہر روز اسی جگہ بیٹھا کرتے تھے لیکن سردیوں میں جب گڑ کی سوندھی سوندھی خوشبو کولہو سے پھیلتی تو گھر والوں کے لاکھ منع کرنے پر بھی ہماری صحبت میں آبیٹھتے۔ وہ آتے تو ہم ان کو گرم گرم رس پلاتے۔ پیڑی کھلاتے حقہ بھر کر رکھ دیتے۔ وہ مزے سے حقہ پیتے رہتے اور قریب قریب آدھی رات تک ہمارے درمیان بیٹھے رہتے۔ آدھی رات کے بعد ہی گھر جاتے۔

شہاب چاچا کا اصل نام شہاب الدین تھا۔ وہ جوانی میں روہیلہ راج کے مشہور چابک سواروں میں سے تھے۔ اب جبکہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچ ہو کر رہ گئے تھے ان کی کلائی ہم دو آدمیوں کی کلائی سے زیادہ چوڑی اور سینہ ۳۸ انچ کا تھا۔ جوانی میں بھیم کے بھیم ہوں گے۔ روہیلہ راج میں تھے وہ چابک سوار لیکن شکار کا اتنا شوق تھا کہ شہاب الدین چابک سوار کے بجائے "شہاب الدین شکاری" مشہور تھے۔ ستر برس کی عمر میں گھر آئے

اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ تنکاریوں کا لباس برجیس اور کوٹ وغیرہ پہننا انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔ سردیوں میں پنڈلیوں پر پٹیاں لپیٹ لیتے۔ اس کے اوپر روئی دار پاجامہ پہنتے باقی جسم پر کرتہ، کرتے پر روئی دار بنڈی، بنڈی پر کوئی پرانا کوٹ اور سب سے اوپر لحاف املی کی جڑ سے ٹیک لگا کر اس طرح بیٹھتے کہ رس پکانے کے لئے ایندھن جھونکنے کا دہانہ ٹھیک ان کے سامنے ہوتا۔ وہ بیٹھے بیٹھے حقہ گڑ گڑایا کرتے اور ہماری باتیں سُنا کرتے۔

گڑ کا کیا بھاؤ ہے؟ دلارے کو تین ماہ کی سزا ہو گئی۔ پنڈت سوامی دیال کا لڑکا بی، اے میں پڑھتا ہے۔ کلو دادا کی پوتی کی شادی ہو گئی۔ یہ اور اس طرح کی باتوں سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان باتوں سے ان کو نیند آنے لگتی لیکن جب کوئی بات ان کی زندگی کے واقعات، آنکھوں دیکھے حالات یا ان کی آپ بیتی سے ٹکرا جاتی تو وہ خود بخود نیند سے چونک جاتے اور پھر تردید یا تائید میں ایسے حیرتناک واقعات سُناتے جن کو دراصل حادثات کہنا چاہیئے۔ ان واقعات اور حادثات میں عبرت انگیز اور تجربہ آمیز کہانیاں سموئی ہوتیں ان میں ہمیں ایسا مزہ آتا کہ اگر شہاب چاچا ان کے سنانے میں دیر لگاتے تو ہم خود ایسی بحثیں چھیڑ دیتے کہ وہ زبان کھولنے کے لئے مجبور ہو جاتے۔

آج شہاب چاچا آ کر بیٹھے تو کسی نے مخدوم دادا کی بہو کا قصہ چھیڑ دیا اور پھر وہی ہماری گفتگو کا موضوع بن گیا "عورت بڑی وہمی ہوتی ہے"۔ "عورت ناقص العقل ہوتی ہے"۔ "عورت بناؤ سنگار کی دلدادہ ہوتی ہے"۔ "حریص ہوتی ہے"۔ "خود غرض ہوتی ہے"۔ "ڈرپوک اور بزدل ہوتی ہے"۔

یہ اور اس طرح کے خیالات ہم سب ظاہر کر رہے تھے ابھی اور نہ جانے کیا کیا کہتے کہ اچانک شہاب چاچا گرجے "بالکل غلط ہے" وہ املی کے پیڑ کی جڑ سے ٹیک لگائے قریب قریب لیٹے تھے۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اب ان کی زبان سے حادثوں کی ندی بہنے میں صرف یہ کسر تھی کہ کوئی کچھ پوچھ بیٹھے، میں نے کہا "چاچا ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ رات کو چوہیا چوں کر دے تو ہماری گھر والی کا دم نکل جاتا ہے۔ ہماری پڑوسن پکی عمر کی ہے مگر اب بھی رات کو گھر سے باہر نہیں جا سکتی، گجودھر کی بھابی رات کو چھت کا پرنالہ دیکھتی ہے تو اسے وہم ہو جاتا ہے کہ بھوت جھانک رہا ہے اور پنڈت سوامی دیال کی پتنی ...."

"اچھا بس بس رہنے بھی دے یہ گواہیاں اور ثبوت!" چاچا نے ڈانٹ کر مجھے روک دیا اور میں ہی نہیں ہم سب سمجھ گئے کہ بوڑھے تجربہ کار کو کوئی چشم دید واقعہ یاد آگیا کوئی آپ بیتی کلبلا رہی ہے۔ ہم سب چپ ہو گئے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ایک عورت ہی تھی جس نے چیتا مار گرایا تھا۔"

"عورت ؟" ہم سب کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔ کلو دادا ہم سب میں بڑے تھے انھوں نے کہا:۔

"چاچا! کیا کہتے ہو ؟ عورت نے چیتا مار گرایا ؟"

"ہاں ہاں! وہ عورت ہی تھی وہ بڑی بزدل مشہور تھی۔" شہاب چاچا نے کلو دادا کی طرف دیکھ کر کہا ہم سب ہنسنے لگے۔ "بزدل بھی اور چیتا مار بھی۔"

"تم کو یقین نہیں آتا۔ تم نے عورت کو اس کے اصل روپ میں دیکھا ہی نہیں میں نے

دیکھا ہے۔" چاچا نے لحاف اپنی کمر تک اُتار کر داہنا ہاتھ باہر نکال لیا۔ ہم سمجھ گئے کہ اب ان میں گرمی آگئی ہے۔

"تو سنو گے تم سب ؟"

"ضرور سنیں گے پھر آپ کی زبان سے کیوں نہ سنیں گے۔"

"اچھا تو سنو، یہ اس زمانہ کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔" میں مسکرایا۔ "چاچا یہ آتش کون تھا ؟"

"ارے تو نہیں جانتا۔ مڈل پاس کیسے ہوگیا۔ یہ اشعار نہیں پڑھے تو نے: ؎

کام ہمّت سے جوانمرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

میں نے دیکھا کہ چاچا کا دریائے سخن دوسری طرف مڑا جا رہا ہے میں نے کہا "چاچا! چیتے کو مارنے والی کے بارے میں کہئے۔"

"وہی کہوں گا چاچا نے سر ہلا کر کہا " ہمت کی بات اس میں بھی ہے۔ اچھا تو چاچا اپنی کہانی کی طرف مڑے"۔ مطلب یہ کہ جب میں جوان تھا اس وقت کی بات ہے اب جو یاد آئی تو ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ نواب صاحب کے یہاں ایک انگریز لفٹیننٹ آکر مہمان ہوا۔ میری طرح شکار کا بڑا شوقین تھا اس نے آتے ہی اپنے شوق کا اظہار کیا کہ چیتوں اور شیروں کا شکار کھیلنا ہے۔ انہی دنوں کجلی بن کا ایک چیتا روہیلہ اسٹیٹ میں گھس آیا تھا اور اس نے بڑی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ انسانوں کا خون اس کے

دانتوں میں لگ چکا تھا۔ نواب صاحب نے مجھے بلایا۔ لفٹیننٹ صاحب سے تعارف کرایا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ میں اس وقت یہ موٹا (چاچا نے اپنے دونوں بازو تان کر بتایا) پانچ پانڈوں کا بھیم تھا۔ میری کلائی دیکھو (چاچا نے آستین چڑھا کر دکھائی) یہ کلائیاں بھری بھری ہوئی اور جوانی ہو تو بیٹا محمود! (میری طرف دیکھ کر چاچا بولے، تم کہو گے کہ دیو کی کلائیاں ہوں گی انگریز بہادر ہاتھ ملا کر ہی مان گیا کہ یہ چابک سوار محض چابک سوار ہی نہیں ہے سمجھے تم سب!"

"ہاں چاچا! آج بھی تو آپ جھوم جھوم کر چلتے ہیں۔"

چاچا اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئے۔ اچھا تو میں نے نواب صاحب سے عرض کیا۔ حضور اس آدم خور چیتے نے علاقے میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔ نہ جانے کتنے بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو اٹھا لے جا چکا ہے۔ تین شکاریوں کو کھا چکا ہے۔ کرنل صاحب سے کہئے کہ اس کا شکار کریں۔

میری گذارش سن کر نواب صاحب مسکرائے۔ لفٹیننٹ کی طرف دیکھنے لگے واقعی وہ انگریز یکّا شکاری تھا وہ اس ہیبتناک چیتے کو مارنے کے لئے تیار ہو گیا۔ نواب صاحب نے مجھے حکم دیا کہ انتظام کرو اور پرسوں صاحب کو لے کر روانہ ہو جاؤ۔"

"جو حکم سرکار!" کہہ کر میں نواب صاحب کی خدمت سے واپس ہوا میں نے دلاور سے کہا" کہو ہمت ہے" دلاور بڑا جیالا جوانمرد تھا اور میرا شاگرد بھی۔ اس کا رشتہ دار ایک بچہ بھی چیتے کا نوالہ بن چکا تھا۔ وہ خار کھائے بیٹھا تھا۔ جھٹ تیار ہو گیا میں نے

اسے ہدایات دیں اور "پرسوں" آیا تو میں صاحب کو لے کر ایک گاؤں میں گیا۔ چیتے نے سب سے زیادہ نقصان اسی گاؤں کو پہنچایا تھا۔ گاؤں والوں نے ہمیں دیکھا تو ہمارے گرد جمع ہو گئے اور ان میں سے کسی نے دکھ بھری کہانی سنائی کہ کس طرح چیتا ہیمراج کو اُٹھا لے گیا۔ اور کس طرح دلّو کی عورت کو نہر پر سے اُچک لے گیا۔ سچ مچ وہ سب خوفزدہ اور ہراساں تھے۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے چیتا اب کہاں ہوگا؟" میں نے گاؤں والوں سے پوچھا؟ انھوں نے بتایا کہ تین دن سے ہمارے گاؤں میں کوئی واردات نہیں ہوئی۔ سنا ہے کہ اب وہ تلونڈی گاؤں کی طرف دیکھا گیا ہے۔"

یہ سن کر ہم نے اپنے گھوڑے تلونڈی گاؤں کی طرف موڑ دئیے۔ گاؤں والوں نے ازراہِ ہمدردی کچھ اس طرح کے فقرے اپنی زبان سے نکالے "کون جانے یہ شکاری زندہ بچ کر بھی آئیں گے یا نہیں؟"

تلونڈی گاؤں کو راستہ ڈھاک کے چھوٹے بڑے ایک مختصر سے جنگل میں ہو کر گیا ہے۔ ہم اسی طرف چلے۔ جنگل کے پاس پہونچے تو دلاور نے چوکنّا کیا "صاحب بہادر سے کہئے کہ رائفل تیار رکھیں، چیتا بڑا ہی دھوکے باز ہوتا ہے نہ جانے کدھر سے حملہ کر بیٹھے"۔ دلاور کے کہنے سے پہلے میں نے رائفل تیار کر لی تھی۔ صاحب بہادر بھی چوکنّا ہو گئے۔

ہم جنگل میں داخل ہونے والے ہی تھے کہ دو کسان کندھوں پر ہل رکھے اندر سے آتے دکھائی دئیے دلاور نے کہا "ہمیں غلط خبر دی گئی۔ چیتا ادھر کہیں نہیں ہے اگر وہ یہاں ہوتا

یہ کسان اس طرح جنگل سے نہیں گزر سکتے تھے۔"

دلاور کی بات ہماری سمجھ میں آگئی لیکن گھوڑوں کو آگے بڑھنے دیا۔ وہ دونوں کسان پاس آئے تو انھوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں صاحب کے آگے بھی جھک گئے پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔"شہوار صاحب! (دراصل وہ مجھے شہسوار کہنا چاہتے تھے) آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"چیتے کی تلاش میں جا رہے ہیں۔"

"شہسوار صاحب! چیتا زندہ ہوتا تو آپ ہمیں اس جنگل میں نہ دیکھتے۔"

"کیا مطلب تمہارا؟"

"اُسے تو ایک عورت نے مار گرایا۔"

عورت نے! بالکل اسی طرح تعجب کے لہجے میں میری زبان سے نکلا جیسے تم سب نے حیرت کے ساتھ کہا تھا۔ میں نے صاحب بہادر سے کہا تو وہ بھی دنگ رہ گئے۔

"وہ کوئی شکاری عورت تھی؟" صاحب نے مجھ سے پوچھا اور میں نے کسانوں سے۔

"نہیں صاحب! وہ تو ایک گنوار عورت ہے۔"

"ارے تو اس کی یہ ہمّت!"

"شہسوار صاحب اس نے کلہاڑی سے اس کا سر پھاڑ دیا۔"

"کلہاڑی سے آمنے سامنے ہو کر؟"

ہم سب کو بڑی حیرت تھی یقین نہیں آ رہا تھا مگر دونوں کہہ رہے تھے اور ثبوت یہ

دے رہے تھے کہ دیکھئے ہم دونوں دندناتے ہوئے اس جنگل سے گزرے ہیں"۔
حیرت اور تجسس نے ہم سب کو بے چین کر دیا۔ کسان تو یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ ہم نے ارادہ کر لیا کہ اس عورت کو ضرور دیکھیں گے۔ اتنے میں کسانوں نے مڑ کر کہا۔" شہسوار صاحب نواب صاحب سے کہئے گا کہ ٹھاکر صاحب بلدیو سہائے نے بدلیا کے شوہر سے کھال چھین لی ہے اور وہ نواب صاحب سے پانچ ہزار کا انعام لینے جائیں گے"۔
"ہوں"۔ میں نے بڑھا کر کہا اور ہم سب جنگل میں داخل ہو گئے۔ امن کے ساتھ گزر گئے آگے ایک میل کی دوری پر تلونڈی گاؤں نظر آیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے دکھائی دیئے انھوں نے ہم کو گھوڑوں پر دیکھا تو ایک نے دوسرے کو انگلی سے اشارہ کیا۔ پھر جب ہم گاؤں میں پہنچے تو بہت سے لوگوں نے جن میں بچے، جوان، بوڑھے عورت مرد سب تھے ہمیں گھیر لیا۔ وہ لوگ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک چیتا مارنے کی کہانی ہمیں سنانے کے لئے بے تاب دکھائی دے رہا تھا۔ ہر ایک بول رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ایک ایک کر کے بولو۔ بتاؤ وہ عورت کہاں ہے"۔ وہ عورت مجمع میں نہیں تھی۔ اس کا شوہر رمضانی موجود تھا وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔
جس وقت رمضانی کے گھر ہم سب پہنچے تو رمضانی دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔" اری جلدی جھاڑو دے تیرے گھر نواب لوگ آئے ہیں۔ چادر جلدی نکال، چارپائی پر بچھا دے۔ توبہ! کتنا گندہ بنا کر رکھا ہے سارا آنگن!
رمضانی کی گھبراہٹ دیکھ کر ہم گھوڑوں سے اُتر پڑے اور سیدھے اس کے گھر میں

گھس گئے۔ آنگن واقعی گندہ تھا۔ چولھا ویسے ہی راکھ سے بھرا پڑا تھا۔ برتن اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ گھر کی کوئی چیز اپنی جگہ پر نہ تھی۔ چیتے۔ کے خون کے دھبّے اور تھکّے ہم نے گھر کے دروازے پر دیکھے۔ رمضانی کی ڈانٹ سُن کر بدلیا نے گھونگھٹ ڈال لیا۔ وہ دوڑ کر ایک اُجلی چادر نکال لائی۔ رمضانی معزز مہمانوں کی آمد سے ایسا بوکھلا یا ہوا تھا کہ اس نے کھرّی کھٹیا پر یہ بھی نہ دیکھا کہ دری یا گدّا ہے یا نہیں، بس ویسے ہی چادر ڈال دی اور بولا "صاحب بڑی اَلھڑ ہے پانچ برس ہو گئے بیاہ کو، سگھڑ پن نہ آیا۔ پھر صاحب یہ بھی ہے کہ یہ آج کل بدحواس بھی ہے۔ ڈری ہوئی اور سہمی ہوئی۔ وہ دیکھئے کوٹھری میں بھاگ گئی۔"

"نہیں رمضانی! وہ تو بڑی بہادر ہے، تم اس سے کہو اپنے بچے کو لے آئے رمضانی کوٹھری میں گیا۔ کُھسر پُھسر کچھ اس سے کہا" اری چل کیوں نہ!"

وہ بچے کو لے کر آئی۔ اس نے بچے کو کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور بچے کو ہاتھوں پر رکھ کر میرے قدموں کی طرف جھکنے لگی۔ میں نے دیکھا بچہ سو رہا تھا۔ شاید وہ دیر سے سو رہا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سَو کا نوٹ نکال کر بچے کے گریبان میں پھنسا دیا۔ "بہو اچھی ہے تو ہے" میں نے مسکرا کر کہا۔ بدلیا شرما گئی پھر میں نے صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ان کو بھی سلام کیا۔ صاحب نے بھی سَو کا پتہ دیا۔ دلاور نے دس کا نوٹ دیا۔

میرا خیال تھا کہ بدلیا روپیہ پا کر اور ہمیں دیکھ کر اپنا پورا کارنامہ بڑے فخر کے ساتھ

بیان کرے گی۔ لیکن وہ سچ مچ جیسا تم سب کہتے ہو نا کہ عورت بزدل ہوتی ہے وہ کچھ ہی دیر کے لئے بزدلی کے اوپری خول سے نکلی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر اسی خول میں گھس گئی۔ میں نے اس سے کہا "بہو کیسے مارا تو نے چیتا" تو چیتے کا نام سنتے ہی اس نے اپنے نو مہینے کے بچے کو سینے سے چمٹا لیا اور تھر تھر کانپنے لگی۔ اور اسی جگہ بیٹھ گئی۔ اگر نہ بیٹھتی تو گر پڑتی رمضانی نے بتایا کہ حضور! یہ جنم کی ڈرپوک ہے۔ دیکھئے تو آپ نے چیتے کا نام لیا اور اس کے چہرے کا رنگ پھک (فق) ہو گیا۔

واقعی بدلیا کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بھولی بھالی گنوار الھڑ عورت تھی۔ میں شاباشی دے دے کر اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ رمضانی اُسے بولنے پر اکسا رہا تھا وہ کچھ کہنے کے لئے ہماری طرف منہ کرتی لیکن سامنے دروازہ دیکھ کر پھر سہم جاتی اور زبان سے اپنے ہونٹ چاٹنے لگتی۔ میں نے رمضانی سے کہا " اسے پانی پلاؤ" اس کے گھر کے باہر بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مجھے بار بار یہ بھی خیال آرہا تھا کہ چوکیدار ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد چوکیدار دوڑتا ہوا آیا۔ کھال اس کے پاس تھی اس نے آتے ہی مجھے سلام کیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اس نے کھال پیش کی اور کہا کہ ٹھاکر صاحب نے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجنے کے لئے منگالی تھی۔ آپ دو بجے کھانا انہی کے ساتھ کھائیں گے۔ ٹھاکر صاحب نے یہ پانچ سو روپے بدلیا کے لئے بھیجے ہیں۔

چوکیدار سے میں یہ سُن کر مسکرا دیا۔ صاحب بہادر یہ سب کچھ نہایت خاموشی سے دیکھ سُن رہے تھے۔ وہ اپنی ڈائری نکالے کچھ نوٹ کرنے میں لگے تھے۔ کھال آئی تو

ایک طرف گھبرا کر بدلیا اس طرح بھاگی جیسے زندہ باگھ گھر میں گھس آیا ہو۔ وہ تو بچے کو لے کر کوٹھری میں گھس گئی۔ ادھر صاحب نے جیب سے پیمانہ نکالا۔ پیمانہ کا کور ناپا اور ایک فیٹ، دو فیٹ، تین فیٹ پورے بارہ فیٹ کا فیتہ چیتے کی کھال پر لمبا لمبا رکھا نظر آیا۔ پھر کھال کی چوڑائی ناپی گئی۔ چاروں پیروں کی ناپ لی گئی۔ آخر میں دم کی پیمائش ہوئی دم زیادہ لمبی نہیں تھی بلکہ چھوٹی تھی یہی دو فیٹ ۳ انچ۔

پیمائش سے فارغ ہو کر وہ مڑے، بولے "ول! وہ لیڈی کدر" یعنی وہ بدلیا کہاں گئی۔ رمضانی پھر سمجھا بجھا کر اُسے لے آیا اسی وقت مجھے خیال آیا کہ بدلیا اس وقت کچھ نہ بتائے گی۔ اس سے پھر باتیں کرنی چاہئیں۔ میں نے چوکیدار سے کہا کہ صاحب تو ٹھاکر صاحب کے مہمان ہوں گے اور میں رمضانی کا دلاور صاحب کے ساتھ جائے گا۔ گھوڑے وہیں لے جاؤ۔

"بہت اچھا سرکار" کہہ کر چوکیدار بھاگا اور اس نے جا کر ٹھاکر صاحب کو اطلاع دی وہ دوڑے آئے۔ میں تو ٹھیک سے متوجہ نہیں ہوا۔ بس سلام کر لیا وہ بھی دکھاوے کا اور رمضانی سے باتیں کرتا رہا۔ دلاور کو اشارہ کیا کہ صاحب کو لے کر جائے، صاحب سے میں نے کہا کہ پہلے میں بدلیا سے پوری کہانی سُن لوں۔ پھر آپ سے کہوں گا۔ میں اس سے بے تکلف ہونا چاہتا ہوں۔ صاحب ٹھاکر صاحب کے ساتھ چلے گئے۔ میں نے دو آدمیوں کو حکم دیا کہ رمضانی کی مدد کریں اور ایک عورت کو بُلا لائیں جو بدلیا کے گھر ہمارے لئے کھانا تیار کرے۔ اس حکم کے ساتھ بیس روپے میں نے دئیے۔

صاحب کے جانے کے بعد بدلیا کوٹھری سے نکلی۔ اب وہ کچھ کچھ شرما رہی تھی اور کچھ کچھ مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا "سرکار کوٹھری میں آئیے نا!" میں رمضانی کو لے کر اس کی کوٹھری میں چلا گیا۔ "سرکار لیٹیے!" میں بے تکلف کوٹھری میں پڑی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک میلا سا تکیہ سرہانے دری کے نیچے تھا۔ یہ چارپائی کچھ بڑی تھی مگر ــــــ!"

مگر کہہ کر شہاب چاچا نے اپنے پاؤں پھیلا دئے پھر بولے "پھر بھی وہ چارپائی میرے قدموں سے قریب ایک فیٹ چھوٹی تھی آدھی پنڈلی تک میرے پاؤں چارپائی سے نکل رہے تھے۔ میرے پاؤں کے نیچے بدلیا نے ایک لکڑی کا صندوق کھسکا کر رکھ دیا۔ اسی دوران اس کا منّا کنمنایا وہ ادھر مڑنے لگی میں نے کہا "بہو جا! اسے نہلا دھلا کر لا اور میری گود میں دے دے۔"

بدلیا بہت خوش ہو گئی۔ کھانا پکانے کے لئے عورت اور دونوں آدمی آچکے تھے۔ وہ آنگن صاف کر کے باورچی خانے میں گھس گئے۔ باورچی خانہ کوئی خاص عمارت نہیں تھی۔ بلکہ ایک کونے میں الگ چھپر یا پڑی تھی اسی میں چولہا اور کچھ برتن رکھے تھے۔ بدلیا منے کو بہلانے لگی۔ وہ رونے اور چیخنے لگا۔ تیکھے پن سے بولی۔

" ددّا آئے ہیں نا! اب ان کو نخرے دکھائے گا۔ اس نے مڑ کر کوٹھری کی طرف دیکھا میں سُن کر مسکرا رہا تھا اور رمضانی کہہ رہا تھا۔ دیکھئے سرکار! اپنے آپ تو خوب چہکے گی اور دوسرا کچھ پوچھے تو جیسے منہ میں زبان ہی نہیں۔!"

"اری لے آ! "میں نے ہنس کر کہا۔ بدلیا نے اپنی اوڑھنی میں منّے کو لپیٹ لیا۔ پھر کوٹھری میں آئی۔ ایک پوٹلی سے گاڑھے کا نیا کرتہ نکال کر اسے پہنایا اور کچھ باندھ دیا اور پھر رمضانی کو اشارہ کیا کہ لے کر سرکار کو دے دے۔

"تو خود دے کیوں نہ! دوّا ہوئے جو" ! اور یہ کہہ کر رمضانی نے قہقہہ لگا دیا۔ بدلیا شرما گئی۔ پھر اس نے منے کو میری طرف بڑھایا اور منھ دروازے کی طرف کر لیا۔ میں نے منے کو لے کر سینے پر کھڑا کر لیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے لیا۔ "ون ٹو تھری۔ ہاں بیٹے، اُٹھو بیٹے"! میری اس حرکت سے بدلیا ہنسنے لگی" سرکار بڑا شریر ہے یہ!

"ہٹ ری اپنے آپ دوّا کہتی ہے اور سامنے آ کر سرکار"! پندرہ بیس منٹ اسی طرح تیکھی پھیکی باتیں کر کے میں نے بدلیا کو بے تکلف کر لیا۔ بار بار اس کی کوٹھری کی چیزوں کو بھی دیکھتا ــــ"

قصہ مختصر یہ کہ جب میں رمضانی کے ساتھ کوٹھری میں کھانا کھا رہا تھا اس وقت تک وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ پندرہ پندرہ منٹ کے بعد میں نے چھیتے کا نام بھی لیا۔ میں نے اتنی بار چھیتے کا نام اس کے سامنے لیا کہ اب اس نام سے اسے وحشت کم ہو گئی۔ اس کے بعد بڑی ترکیب سے سارا واقعہ پوچھ لیا۔

یہاں تک کہ شہاب چاچا کہانی سنا کر رُکے انھوں نے حقہ کی طرف دیکھا۔ ہم سب کہانی سننے میں محو تھے۔ چاچا نے حقہ کی طرف دیکھا تو ولا ورجھٹ چلم بھر لایا اور نیچا چاچا کے ہاتھ میں دے دیا۔ شہاب چاچا نے حقہ کا دم لیا اور پھر ایک لمبا کش کھینچا اور پھر ادریہ وقت

ہمارے لئے بڑی بے چینی کا تھا۔ ہمارے خیال میں کہانی پوری کی پوری باقی تھی چاچا نے اپنی لچھے دار باتوں میں ابھی تمہید ہی ختم کی تھی ہم سب سے ضبط نہ ہو سکا۔ ہم میں سے کئی ایک ساتھ پوچھ بیٹھے۔ "چاچا پھر کیسے مارا اس نے چیتا"؟

"سنو، اب پورا قصہ یوں ہے" چاچا نے کہنا شروع کیا" ہوا یہ کہ ایک دن گاؤں میں خبر پھیلی کہ چیتا گاؤں کے اس کنارے ہمارے کھیتوں تک آگیا ہے کھیتوں سے گزر کر یقیناً گاؤں کا رخ کرے گا۔ اس خبر نے گاؤں بھر میں کھلبلی ڈال دی۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے آدھا گاؤں خالی ہو گیا۔ گاؤں میں کچھ مالدار لوگ تھے وہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اب یہ رہ گئے۔ یا وہ لوگ جن کے رشتہ دار یا تو دور دراز گاؤں میں رہتے تھے یا تھے ہی نہیں۔ رمضانی اس خبر سے ایک دن پہلے سات آٹھ کوس دور ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ شام کو کسی نے یہ دہشت ناک خبر سنائی کہ چیتا جنگل سے نکل کر کھیتوں میں آگیا اور اب وہ اسی طرف بڑھا چلا آرہا ہے اب تو ان کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ جو اپنے گھروں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے انھوں نے "جان ہے تو جہان ہے" پر عمل کیا۔ اور سامان گھروں میں چھوڑ کر بال بچوں کو لے بھاگے۔ اب گاؤں میں وہ لوگ ہی رہ گئے تھے جو "چمڑی جائے دمڑی نہ جائے" کے مصداق تھے یا پھر رمضانی جیسے لوگ یا پھر ٹھاکر صاحب جن کے گھر میں دو بندوقیں تھیں۔ ٹھاکر صاحب نے ایک بندوق بڑے بیٹے کو دے کر اُسے اٹاری کی کھڑکی پر بٹھا دیا اور خود دو منزلے کے اس کمرے میں جا بیٹھے جو راستے پر تھا۔ ان کے بال بچے ایک بڑے ہال میں بالکل محفوظ تھے۔ بدلیا بے چاری بہت

پریشان تھی۔ اس کا شوہر باہر گیا ہوا تھا۔ تم سب کہوگے کہ وہ بے وقوف سب کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوتی۔ تم کہوگے کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے اس کے گھر میں تھا ہی کیا جس کی وجہ سے وہ گھر سے بھاگ نہ سکی تم کہوگے کہ عورت بزدل ہوتی ہے مگر ان مردوں کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جو ایسے بدحواس ہو کر بھاگے تھے کہ انھیں یہ بھی ہوش نہ تھا کہ جدھر بھاگے جا رہے ہیں کہیں اسی طرف چیتا نہ چھپا ہو جس کی وجہ سے وہ گھر سے بھاگ نہ سکی۔

گاؤں کے زیادہ تر گھر خالی ہو گئے۔ لیکن بدلیا گھر میں دبکی رہی اُسے دو خطرے ستا رہے تھے ایک تو یہ کہ کہیں اس کا شوہر واپس آرہا ہو اور چیتا اسے کھا گیا ہو۔ دوسرا یہ کہ چیتا گھر میں گھس آیا تو وہ کیا کر سکے گی ؟ اس سے کچھ لوگوں نے کہا بھی تھا کہ ہمارے ساتھ نکل بھاگ ہم تجھے تیرے رشتہ داروں میں پہنچا دیں گے۔ لیکن وہ شوہر کی رائے کے بغیر گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سب کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اور منّے کو سینے سے چمٹائے ہوئے تھی۔

سورج غروب ہو گیا۔ گاؤں پر موت بادل کی طرح چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چڑیاں بھی اپنے گھونسلے چھوڑ کر کہیں بھاگ گئیں۔ بدلیا کوٹھری میں تھی اسے یاد آیا کہ باہری دروازے کی کنڈی بھی نہیں لگائی ہے۔ اس نے اپنے منے کو دیکھا اسے چوما "میرے لال! میں تیرے لئے سب کچھ کر گزروں گی" کہہ کر وہ اُٹھی۔ کوٹھری سے باہر

آنگن میں دیکھا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن بدلیا کو ایسا لگا جیسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر جھکی جھکی دروازے تک گئی۔ اس نے کنڈی لگا دی۔ کنڈی لگاتے وقت اس نے دروازے پر نظر ڈالی۔ یہ تو چیتے کے ایک دھکے میں چرچرا کر گر جائے گا۔ سنتے ہو کلّو بھیّا! اس "بے وقوف" نے گھر کی رسی لی اور کمزور دروازے پر تان دی۔ اپنے خیال میں چیتے کا راستہ بند کر کے وہ کوٹھری میں چلی گئی۔ کوٹھری کی کنڈی لگالی اور بچے کو سینے سے لگا لیا۔ جب یہ سب ہو گیا تو سنتے ہو محمود میاں (چاچا نے مجھے مخاطب کیا) وہ ڈرپوک عورت اب پھر ڈرنے لگی۔ اس کا جسم اب پھر تھر تھر کانپنے لگا۔ پھر اسے یاد آیا تو وہ رونے لگی۔ پھر اس "ناقص العقل" پر بدحواسی سی چھا گئی۔ بنی بھیا سُن رہے ہو نا! اس نے بچے کو چارپائی پر لٹا دیا اور اس پر چادر ڈال دی پھر اس نے کواڑ کی دراڑ سے صحن میں دیکھا پھر اس نے چپکے سے کنڈی کھولی اور آنگن میں آگئی بیچ صحن میں آکر زور زور سے پکارنے لگی "منے کے ابا گاؤں کی طرف نہ آنا۔ وہیں رہنا نہیں تو چیتا تم کو کھا جائے گا۔"

"تھی نا وہ بے وقوف!"

شہاب چاچا نے ہم سب پر ایک نظر ڈالی۔ ہم سب ایسا ہمہ تن گوش ہو کر اس قصے کو سُن رہے تھے کہ چاچا کو کچھ جواب نہ دے سکے اور نہ ہی سمجھ سکے کہ چاچا نے کیوں ہم پر بات ماری چاچا ہم سب کو مبہوت دیکھ کر خود ہی کہنے لگے:۔

"کیسی بے وقوف تھی وہ عورت۔ اس کا خاوند سات آٹھ کوس دور ایک گاؤں میں بیٹھا تھا اور وہ اسے پکار رہی تھی۔ تم سب کیا جانو عورت ذات کو۔ تم نے اسے بڑے موٹے خول میں بھر دیا ہے۔ خول سے نکال کر اسے دیکھو وہ سراپا محبت ہے اگر وہ ماں ہے تو بیٹے پر جان نچھاور کرنے والی بیوی ہے تو شوہر کی نظریں دیکھنے والی۔ ہے بیٹی ہے تو ماں باپ کی لاج رکھنے والی۔ اور اگر بہن ہے تو بھائیوں کی پیشانی کو چمکانے والی۔ کیا جانو تم سب عورت کو۔ آدم علیہ السلام نے جنت میں رہ کر ایک ساتھی کے لئے دعا کی تو اللہ میاں نے عورت کو پیدا کیا۔ خیر تم تو قصّہ سنو۔

بدلیا صحن ہی میں تھی کہ گلی میں کسی جانور کے بھاگنے کی آواز سنائی دی وہ چونکی اور بھاگ کر کوٹھری میں گھس گئی۔ اچانک گاؤں کے کتے بھونکے بدلیا کا خوف بڑھنے لگا۔ اس نے بچے کو بغل میں بھر لیا۔ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو ڈر کے مارے اس کے دانت اس طرح بجنے لگے جیسے جاڑوں میں سردی سے بجنے لگتے ہیں پھر اس نے گاؤں کے ان پالتو جانوروں کے بھاگنے کی آواز سنی جن کو لوگ یہیں چھوڑ گئے تھے۔ بکریوں کے ممیانے، کتوں کے بھونکنے، گاؤں کے بیل اور بھینسوں کے غوں غوں کرنے سے بدلیا پر ہول طاری ہوگیا۔ مویشیوں کی آوازوں کے اس واویلا میں اسے دل ہلا دینے والی ایک گرج سنائی دی۔ وہ اس گرج کے معنی سمجھ گئی۔ اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اچانک اسے گھر کے سامنے کئی بڑے جانوروں کے سرپٹ بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ اب وہ خوفزدگی کے آخری مرحلے میں تھی اسے ایسا محسوس ہوا کہ چیتا اس

کے صحن میں آ دھمکا۔ اس کی نظر آپ سے آپ صحن کی طرف اُٹھ گئی۔ "ہائے اللہ! کوٹھری کا دروازہ تو کھلا پڑا ہے"۔ اس نے کہا۔ دراصل دوسری بار جب وہ کوٹھری میں بھاگ کر آئی تھی اس وقت بدحواسی میں کوٹھری کے کواڑ بند کرنا بھول گئی تھی۔ اس نے بچے کو چارپائی پر لٹا دیا۔ اور اس ارادے سے بڑھی کہ اس سے پہلے کہ چیتا کوٹھری میں آئے۔ وہ یا تو کواڑ بند کر لے یا پھر اس سے پہلے کہ چیتا بچے کو دھر دبوچے خود چیتے کے منہ میں کود پڑے۔

بدلیا چلی تھی کوٹھری کے کواڑ بند کرنے لیکن کواڑ پکڑے تو دیکھا صحن میں نہ تو چیتا تھا نہ چیتے کا سایہ۔ وہم ہی وہم تھا گاؤں کے مویشی اس کے گھر کے آس پاس بھاگ رہے تھے صحن ہی میں کھڑے کھڑے اسے ایسا لگا جیسے اس کے گھر کے باہری دروازے کو کوئی دھکّا دے رہا ہے۔ وہ سمجھ گئی یہ "کوئی" کون ہو سکتا ہے۔ اب دیکھو اس بزدل عورت کی "بزدلی" پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ بولی "تم مجھے کھا سکتے ہو لیکن میرے بچے کو نہیں کھا سکتے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی کواڑوں کی دراڑوں سے اس نے صاف دیکھ لیا کہ چیتا کواڑ دھکیل رہا ہے۔ اسے شوہر کی یاد آ گئی۔ اس نے کہا "پہلے مجھے یہ بتا تو نے میرے منے کے ابا کو تو نہیں کھایا۔" اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چیتا رمضانی کو کھا کر اب منے کو اُٹھانے آیا ہو۔

بچے اور شوہر کی یاد نے اس کے ذہن کو بیدار کر دیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی رگوں میں کوئی چیز سرایت کر گئی جس نے اسے اچانک پیچھے کی طرف موڑ دیا وہ تیزی سے کوٹھری میں گئی۔ اندھیری کوٹھری میں اس نے ایک طرف ٹٹولا اور پھر جب وہ نکلی تو کلہاڑی

اس کے ہاتھوں میں تھی۔ سنتے ہو تم سب! عورت اب اپنے خول سے باہر آ گئی تھی اب وہ بپھری ہوئی ایک شیرنی تھی۔ اب وہ نہ ڈری ہوئی تھی اور نہ سہمی ہوئی اس نے بچے کو بچانے اور اپنے خیال میں شوہر کا انتقام لینے کا تہیہ کر لیا تھا وہ کلہاڑی تان کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ چیتے کے ڈھکیلنے سے کواڑ چرچرائے۔ کنڈی لگی کہ لگی رہی اور کواڑ کا ایک تختہ پھٹ کر اندر گر گیا اور اس کے ساتھ ہی چیتے کا سر اندر آ گیا اور پھر رسّی کے بڑے بڑے پھندوں سے بھی باہر آ گیا۔ ٹھیک اسی وقت کلہاڑی اس کے منہ پر پڑی اور اس کی تھوتھنی دانتوں سمیت لٹک گئی۔ چیتے نے زمین ہلا دینے والی ایک دہاڑ ماری۔ ساتھ ہی پیچھے ہٹا تو رسّی کے پھندے کے ساتھ کواڑ کے پھٹے تختے سے اٹک کر رہ گیا۔ کواڑ پھر چرچرایا — کلہاڑی پھر بلند ہوئی اور اب کی بار اس کی کھوپڑی پر پڑی اور گھس کر رہ گئی اور اس کے ساتھ ہی کواڑ ٹوٹ کر باہر گر پڑا۔ کواڑ کے ساتھ کلہاڑی بھی چلی گئی۔ بدلیا کو بس اتنا ہی یاد رہا کہ کواڑ ٹوٹ گیا اور کلہاڑی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ تو وہ اس خیال سے کوٹھری کی طرف بھاگی کہ بچے کے اوپر لیٹ جائے تاکہ چیتا بچے سے پہلے اسے آکر دبوچے لیکن وہ صحن ہی میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ کیسی بزدل اور بے وقوف تھی وہ عورت کیوں نہ؟

شہاب چاچا چپ ہو گئے۔ ہم سب نے ایک لمبی سانس لی ہم سمجھ رہے تھے کہ شہاب چاچا نے ہم پر طنز کیا ہے۔ ہم نے ان کے طنز کا جواب نہیں دیا۔ ہماری زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

"پھر کیا ہوا چاچا؟"

"پھر کیا ہوتا وہ دن چڑھے تک بے ہوش پڑی رہی۔ دوسرے دن جب اس کا شوہر گھر آیا تو اس نے باہر چیتے کو مرا ہوا دیکھا اور اندر بیوی کو بے ہوش۔ اس نے پانی کے چھینٹے مارے تو اسے ہوش آیا۔ اسی وقت اس نے اپنے بچے کے بلبلانے کی آواز سنی جو بھوک کے مارے چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ وہ ہوش میں آتے ہی کوٹھری کی طرف بھاگی اور بچے پر جا گری۔ رمضانی نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا اور بتایا کہ چیتا باہر پڑا ہے۔ اب کیوں ڈر رہی ہے اری بے وقوف کتنی بزدل ہے تو۔ دیکھ چل کر۔!

رمضانی نے بہت کہا۔ مگر اب عورت پھر موٹے خول میں گھس گئی تھی۔ وہ کسی طرح بھی کوٹھری سے باہر نہ نکلی۔ رمضانی نے جا کر ٹھاکر کو بتایا کہ چیتا مارا جا چکا۔ ٹھاکر نے اس کی لاش اٹھوالی۔ کھال نکلوالی اور باقی جسم دور ایک گڈھے میں ڈلوا دیا اور رمضانی سے کہا "جا گھر بیٹھ آرام سے" اور لے اپنی کلہاڑی لے جا۔

مشہور ہو چکا تھا کہ چیتا مارا جا چکا ہے لیکن بدلیا ابھی تک یہی خواب دیکھے جا رہی تھی کہ چیتا اس کے بچے کو کھانے کے لئے سامنے کھڑا ہے۔ رمضانی نے اس سے بہت پوچھا کہ چیتا کس نے مارا لیکن وہ کچھ نہ بتا سکی۔ وہ اتنا ڈری ہوئی تھی واقعی اسے اس کی کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا چیز اس کی رگوں میں سرائت کر گئی تھی جس نے چیتے کے مقابلہ میں کلہاڑی اٹھانے پر مجبور کیا مامتا کی قوت یا خاوند کی محبت کے سوا اسے ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

شہاب چاچا نے قصہ ختم کر دیا۔ مگر ایک سوال اب بھی ہمارے دلوں میں

کلبلا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"چاچا! پھر انگریز بہادر نے کوئی اور چیتا مارا ہوگا؟"

اس سوال پر شہاب چاچا پہلے تو ہنسے پھر یک دم سنجیدہ ہو گئے۔ بولے" میں نے صاحب بہادر سے کہا" اب آپ کوئی اور چیتا ماریئے چل کر، لیکن وہ انگریز تو ہمارے دیس کا پُرانا راجپوت نکلا۔ اس نے جواب دیا مرد ہو کر اب رائفل سے چیتا مارتے ہوئے شرم آتی ہے۔" اور پھر صاحب بہادر یہ کہتے ہوئے گاؤں سے واپس ہوئے کہ اب میری شکاری زندگی ختم۔"

......اور دریا میں ڈال

الحمدللہ، میں اپنے شوہر سے ہمیشہ خوش گمان رہی۔ بھول چوک تو انسان سے ہو ہی جاتی ہے، وہ میرے شوہر سے بھی ہوتی لیکن وہ جلد ہی چونک جاتے اور استغفراللہ پڑھ لیا کرتے۔ ان کی اچھی عادتیں مجھے پسند تھیں۔ ان کی اچھی عادتوں کی وجہ سے میں بہت جلد ان سے محبت کرنے لگی۔ اور یہ محبت دن بہ دن بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ بڑے دیندار آدمی تھے۔ قرآن وسنت سے جو بات صحیح سمجھتے وہ کرتے، جو غلط ہوتی اس سے بچتے۔ ہمیشہ سچ بولتے، انھوں نے مجھ پر ہمیشہ اعتماد اور بھروسہ کیا۔ خرچ کے لئے ڈھائی سو روپیہ مہینہ دیا کرتے۔ اس رقم کے بارے میں کبھی مجھ سے حساب نہیں لیا اور نہ میری صندوقچی یا میرا بکس ہی کبھی ٹٹولنے کی کوشش کی۔ انھیں جھوٹ، غیبت، چغلی اور ایسی ہی دوسری باتوں سے سخت نفرت تھی۔ ان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے فیاض تھے۔ اللہ کی راہ میں خوب دیتے۔ اللہ کا نام لے کر کسی نے ہاتھ پھیلایا تو انھوں نے دس بیس روپئے ہاتھ پر رکھ دئے۔

بس میں اس خوبی کی وجہ سے کبھی کبھی ان سے لڑ پڑتی تھی۔ وہ بھی اس لئے کہ آجکل

ڈھائی سو روپیہ میں جتنی روٹی تو کھائی جا سکتی ہے لیکن اگر کوئی چاہے کہ ذرا ٹیم ٹام سے زندگی گزارے، تیز تہوار اور شادی غمی کے موقعوں پر ارمان نکالے تو اس کی گنجائش اس رقم میں نہیں۔ تو ایسے ہی موقعوں پر میں "تریاہٹ" کر بیٹھتی۔ لیکن وہ اپنے اصولوں پر اتنی سختی سے عمل کرتے تھے کہ مجھے ہمیشہ ہار ماننی پڑتی۔ وہ میری یہ دلیل بھی نہیں سنتے تھے کہ جب اللہ کی طرف سے آپ کو ہزاروں کی آمدنی ہے تو آپ اپنے بال بچوں کو کیوں ترساتے ہیں۔ دوسروں کو دینے میں اتنے فیاض ہیں۔ لیکن جن پر خرچ کرنا فرض ہے۔ ان پر نہیں خرچ کرتے؛

وہ میری اس بات کا جواب نہ دے پاتے تو مجھے اور زیادہ بُرا لگتا اور میں سمجھتی کہ ان میں یہ کمزوری ہے۔ اپنا نام کرنے کے لئے اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹتے ہیں۔ یہ بات میں ہی نہیں کہتی، محلہ بھر میں مشہور تھی۔ سارا شہر یہی کہتا تھا۔ لیکن ان کی کمزوری کی وجہ سے میں زیادہ دنوں ان سے کھنچی نہ رہتی بس ایک دو دن اڑتی اور پھر جھک مار کر دھندوں میں لگ جاتی۔ یہ کہہ کر صبر کر لیتی چلو، میاں میں اور بہت سی خوبیاں ہیں۔ ایک یہ خامی ہی سہی۔

میں ان کی ایک خوبی اور بیان کروں۔ وہ بڑے مضبوط دل کے آدمی تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان پر بُرے دن بھی آئے۔ گھر میں موتیں بھی ہوئیں۔ میرے خسر جنھوں نے ایسا بیٹا پرورش کیا، اور جو ایک بزرگ یعنی وُلی تھے۔ ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت بھی میاں "انا للہ" پڑھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ ایک آنسو تک میں نے ان کی آنکھوں میں

نہ دیکھا۔

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سکینہ بی کے مرنے پر وہ رات بھر بے چین رہے بار بار "اناللہ" پڑھتے میرے اصرار کرنے پر بھی رات کا کھانا نہیں کھایا۔ عشاء کی نماز کے بعد جو نفلیں پڑھنا شروع کیں تو گیارہ بجے تک پڑھتے رہے۔ اور ان نمازوں میں سجدے اتنے لمبے کئے کہ میں حیران رہ گئی۔ اس حیرانی کے ساتھ اس وقت میری پریشانی اور بڑھ گئی جب میں نے سجدوں کی حالت میں ان کی ہچکیاں سنیں اور سجدہ گاہ کو نم دیکھا۔

میری پریشانی کا سبب تو میری بہنیں سمجھ گئی ہوں گی۔ یعنی شوہر کی پریشانی ہر اچھی بیوی کو پریشان کر دیتی ہے۔ لیکن میری حیرت شائد سمجھ میں نہ آئی ہو۔ میں حیران یوں تھی کہ بی سکینہ لاکھوں کی جائیداد کی مالک ہوتے ہوئے کنجوس مکھی چوس تھیں۔ کنجوسی میں ان کا بڑا نام تھا۔ گھر میں کیسی ہی تقریب ہوتی، کم سے کم پیسہ اُٹھانے کی کوشش کرتیں۔ اللہ کی راہ میں ایک پیسہ بھی انھوں نے کبھی نہیں دیا۔ مدرسہ اسلامیہ کے لئے چندہ مانگا گیا۔ صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ امانت صاحب اس معاملہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کے پاس جاؤ۔ ہاں بھائی! امانت صاحب کے پاس تو جائیں گے ہی تم کو جو اللہ نے دیا ہے تو کیا قبر میں ساتھ لے کر جاؤ گی اور پھر کیا ہر بات میں میرا شوہر ہی رہ گیا ہے کہ جو بی صاحبہ کے پاس مانگنے گیا خود تو دامن سمیٹ لیا اور دوسرے کی طرف رجوع کر دیا۔ ایسے موقعوں پر سچی بات یہ ہے کہ مجھے بڑا بُرا لگتا۔

سکینہ بی کے مرنے پر میں جانتی ہوں کہ کسی نے بھی غم کا اظہار نہیں کیا۔ امانت صاحب نے

مجھ سے کہا کہ میّت میں جاؤ۔ میں نے صاف انکار کر دیا " کون کنجوس کی میّت میں جائے!"

"سنتِ رسول ہے۔ مسلمان کو اس کے مرنے پر بُرا نہیں کہتے" میاں امانت صاحب نے میری بات کے جواب میں کہا۔ پھر بھی میں نہیں گئی۔ اس دن کے اخباروں میں سکینہ بی کی موت کی خبر تو آئی لیکن ایسے روکھے انداز میں کہ توبہ بھلی۔ زیادہ تر اخباروں کی سرخیاں یہ تھیں

"ایک کنجوس خاتون کا انتقال جو لاکھوں کی مالک تھی"

لیکن اسی خاتون کے مرنے سے میرے میاں امانت صاحب، صرف امانت صاحب نے ایسا سوگ منایا کہ میں حیران اور پریشان رہ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ رات بھر نہ سو سکے بارہ بجے کے بعد جب وہ یہ سمجھے کہ میں بھی سو گئی تو بلند آواز سے سکینہ بی کی مغفرت کے لئے الفاظ نکالنے لگے۔

"پروردگار اپنی اس نیک بندی کی مغفرت فرما! میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ ایک بہترین مسلمان خاتون تھیں۔ اے اللہ! سیکڑوں عورتیں بیوہ ہوگئیں، اے اللہ! آج ہزاروں بچے یتیم ہوگئے۔ اے اللہ! اس نیک خاتون کو بخشش دے"

اور پھر جو رونا شروع کیا تو روتے چلے گئے۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ جھنجھلا کر بولی۔ بس ایک تم ہی اللہ کے بندے ایسے ہو کہ اس کنجوس کا نام لے رہے ہو ایسی نیک نیتی بھی کیا......"

وہ چونک پڑے۔ "زینب! ایسی باتیں مت کرو۔ مسلمان میّت کو ایسا مت کہو۔ تم نے یہ کہہ کر گناہ کیا"

"جی ہاں! گناہ کیا۔ سارا شہر گناہ میں مبتلا ہو گیا۔ آخر آپ اتنے بھولے کیوں بنتے ہیں؟"

"بھولا نہیں، سچ کہتا ہوں۔ میرے پاس آؤ۔"

میں جھنجھلائی ہوئی تھی لیکن شوہر کی اداسی پر ترس آگیا۔ میں ان کے پاس گئی کہنے لگے۔ وہ موٹا سا بڑا رجسٹر تو لاؤ۔

یہ رجسٹر میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اشارہ پاکر رجسٹر اُٹھا لائی اور پھر؟ .... توبہ ہے میرے اللہ!........ اُف اللہ! مجھے معاف فرمایا.......... !..... میں دنگ رہ گئی اور اپنے گال پر چانٹ لگانے لگی۔

"تو آپ نے مجھے کبھی بتایا کیوں نہیں؟"

"تاکید تھی کہ نہ بتاؤں۔"

پھر میں نے زیادہ بات نہیں کی۔ کفارہ کے طور پر میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور اب اس انتظار میں رہی کہ دیکھوں میاں کیا کرتے ہیں۔ پھر میں بھی رات بھر نہ سو سکی۔ میاں جلدی جلدی اس رجسٹر کی مدد سے کچھ لکھتے اور ایک طرف رکھتے رہے ایک بجے مجھ سے کہا:۔

"کیا عرفان کو جگا سکتی ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں! کیا کام ہے؟"

"ابھی صبح صادق اخبار چھپ رہا ہوگا۔ عرفان سے کہو کہ میرا یہ بیان پریس میں

دے آئیے۔"

میں نے عرفان کو جگایا۔ ایک مضمون یا خبر یا بیان جو سمجھئے، انھوں نے عرفان کو دیا اور کہا "بیٹے! جلد جا! اور صبح صادق کے ایڈیٹر کو دے آ۔ زبانی بھی کہہ دینا کہ نمایاں جگہ میں شائع کر دیں۔"

عرفان بائیسکل نکال کر گھر سے بھاگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد لوٹا۔ اور جواب دیا کہ یہ بیان ضرور شائع ہو گا۔

"الحمدللہ! کہہ کر مجھ سے کہا۔ اب ذرا کچھ کھلا پلا دو کل میرا روزہ ہو گا۔"

میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ میں نے جھٹ کھانا پیش کیا۔ میاں کے ساتھ میں نے بھی کھایا دوسرے دن ہمارا روزہ تھا۔

صبح ہوئی تو میرے گھر پر شہر کے بڑے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ پریس کے نمائندوں نے بھی میرے گھر کو گھیر لیا اور سب سکینہ بی کے حالات دریافت کر رہے تھے۔ یہ بھیڑ دیکھ کر طے کیا گیا کہ آج ایک عام جلسہ کیا جائے اور امانت صاحب اس جلسے میں اپنے اس بیان کی تفصیل فرمائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ صبح کو جب اخبار لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچا تو اسی طرح دنگ رہ گئے جیسے میں رجسٹر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ میں نے کہا "اس وقت تو میں سکینہ بی کے گھر جا رہی ہوں ان کے پوتی پوتے اور نواسے نواسیوں کو دیکھوں گی۔ پھر میں بھی جلسے میں جاؤں گی۔ عورتوں کے بیٹھنے کا بھی انتظام ہو گا؟"

"ضرور ہوگا، میں دن بھر جلسے کے انتظام میں رہوں گا۔ تم آجانا اور عرفان، رضیہ، نصرت اور حوّا دکو بھی لانا۔ سب آکر سنیں۔"

"ہاں سب آئیں گے"۔ یہ کہہ کر میں سکینہ بی کے گھر چلی گئی۔ جب میں وہاں پہنچی ہوں تو گھر چھوٹے بڑے گھرانوں کی خواتین سے بھرا ہوا تھا۔ سکینہ بی کی پوتیاں اور نواسیاں زیادہ عمر کی نہ تھیں اور نہ گھر میں کوئی بڑی عمر کا مرد ہی تھا۔ نظم کون سنبھالتا۔ بے چاری لڑکیاں بدحواس ہو رہی تھیں۔ میں نے جاکر نظم سنبھال لیا۔ میں نے دیکھا ساری ہی عورتیں غمزدہ تھیں۔ میں نے سنا ساری ہی خواتین کہہ رہی تھیں کہ امانت میاں نے ہم سب کو بُرے لفظ مُنہ سے نکالنے سے روک دیا۔ ورنہ ہم سب "میری میّت" کو نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے"۔

ظہر کے بعد میں تمام خواتین کے ساتھ جلسہ گاہ کو گئی۔ اللہ اکبر! ایسا مجمع کسی موقع پر کاہے کو کبھی دیکھا ہوگا۔ آدمیوں کا ایک جنگل تھا جو کھڑا تھا وہ تو اچھا ہی ہوا کہ کئی لاؤڈ اسپیکر لگا دئیے گئے تھے۔ جلسہ تلاوت کلام پاک کے بعد شروع ہوا اس کے بعد جناب سید امانت حسین صاحب اپنے بیان کی وضاحت کرنے کھڑے ہوئے، تو مردوں اور ہم عورتوں کے مجمع میں ایسا سکوت چھایا گویا جیسے سب کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں۔ سید امانت حسین نے حمد و ثنا کے بعد کہا :-

"معزز حاضرین اور عزیز خواتین! موت برحق ہے، جو آیا ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور مرے گا۔ کسی کے مرنے پر غمزدہ ہونا بھی ایک فطری بات ہے۔ اس کے متعلق مجھے

کچھ نہیں کہنا ہے لیکن میں آپ صاحبان کی توجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کی طرف لے جاؤں گا جس میں حضور نے تلقین فرمائی ہے کہ مرنے کے بعد کسی مسلمان میت کو بُرا نہ کہو۔ ایک بار اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ایک عورت کے سامنے مدینے کے سب سے بُرے آدمی کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس عورت نے بتایا " بی بی آج وہ مرگیا" یہ سنتے ہی حضرت عائشہ رضؓ نے اس مرنے والے کی مغفرت کے لئے دعا کی۔ عورت کو بڑی حیرت ہوئی۔ پوچھنے لگی کہ جس شخص کو آپ اتنا بُرا کہہ رہی تھیں اب اس کی مغفرت کے لئے دعا کرنے لگیں۔" ام المومنین نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے دیکھا ہے اور ان سے تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ نے مسلمان میت کو بُرا کہنے سے روکا ہے۔"

تو بھائیو اور بہنو! جب ایک بُرے مسلمان کے لئے ہمارے دین میں یہ رعائتیں موجود ہیں تو نیک میت کے لئے تو اور زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے یہی بی سکینہ مرحومہ جن کی دینداری، روزہ نماز کی پابندی اور دوسری باتوں سے تو آپ واقف ہیں لیکن وہ ایک بات میں بدنام رہیں۔ آپ سب انھیں کنجوس کہا کرتے تھے اور اس وجہ سے ان کی دینداری بھی شک کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی لیکن میں عرض کروں آپ نے وہ حدیث بھی سنی ہوگی جس میں ہے انفاق اور خیرات اس طرح کرو کہ داہنے ہاتھ سے دو اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ بخدا میں سچ کہتا ہوں، بی سکینہ مرحومہ اس حدیث پر پوری طرح عامل رہیں۔ آپ سب بھائی اور بہنیں میرے متعلق کہا کرتے تھے کہ سید

امانت بڑا فیاض ہے جو کچھ کماتا ہے سب خدا کی راہ میں جھونک دیتا ہے۔ اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتا بیوی کو اچھا نہیں پہنا تا مگر ہزاروں کی رقم سائلوں، محتاجوں کو بانٹتا رہتا ہے۔

یں عرض کروں۔ دراصل یہ وہ دیہاتی مثل کے مصداق ہے کہ گاؤں میرا نام ترا آپ پوچھیں گے کیسے؟ میں جواب دوں گا کہ یہ دست غیب مجھے بی سکینہ کی وجہ سے ہی حاصل تھا۔

"نعرۂ تکبیر!........" اللہ اکبر"

مردوں کے مجمع سے ایک شور بلند ہوا۔ عورتیں رونے لگیں۔ ہم عورتیں تو نرم دل کی ہوتی ہیں مرد بھی رو رہے تھے۔ اور تو اور وہ صاحب جو اپنے ولی باپ کے مرنے پر نہ روئے جو اپنے جگر کے ٹکڑے فرمان کی موت پر صرف "انا للہ" کہہ کر رہ گئے وہ حضرت بھی اسٹیج پر کھڑے آنسوؤں سے اپنا رومال تر کر رہے تھے۔ نواب مزمل اللہ خاں صاحب اس جلسے کی صدارت کر رہے تھے سنا تھا کہ وہ بھی بڑے مضبوط دل کے آدمی ہیں۔ وہ بھی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے تھے۔ کہنیاں میز پر ٹکی ہوئی تھیں اور آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

سید امانت حسین صاحب پھر کچھ نہ کہہ سکے۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا طبیعت سنبھلی تو منشی امیر احمد صاحب نے بقیہ بیان پڑھا۔ بقیہ بیان دراصل رجسٹر کے حسابات کا کھاتہ تھا جس سے معلوم ہوا کہ دو سو بائیس خواتین کو ماہانہ وظیفے دیئے جاتے تھے۔ اڑتالیس مکتبوں کو سالانہ ایک لاکھ روپیہ دیا جاتا تھا۔ تین یتیم خانے مختلف جگہوں پر قائم تھے

جن کا خرچ بھی اتنا ہی تھا۔ اس طرح اور تفصیلات تھیں۔ منشی امیر احمد صاحب جب یہ تفصیل سنا چکے تو صدر جلسہ اپنے آنسو پونچھ کر اُٹھے۔ کھڑے ہو کر فرمایا۔

اب میں جلسہ ختم کرنے سے پہلے مرحومہ کی وہ وصیت سناتا ہوں جو مجھے ابھی ابھی سید امانت حسین نے دی۔ صدر صاحب نے بتایا کہ "وہ تمام ادارے جہاں جہاں امداد جایا کرتی تھی۔ مرحومہ نے ان سب کے۔ لئے اتنی ہی رقم کی وصیت فرما دی ہے اور یہ دیکھئے یہ وقف نامہ میرے ہاتھ میں ہے جس پر سید امانت حسین صاحب اور مرحومہ کی ایک بالغ پوتی عائشہ اور ایک بالغ نواسی آمنہ کے دستخط ہیں یہ تینوں اس جلسے میں موجود ہیں اور اقراری گواہ ہیں۔ میں انشاء اللہ اس وقف نامہ کو کل رجسٹرڈ کرا دوں گا"۔

اس کارروائی کے بعد عصر سے پہلے جلسہ برخاست ہوا۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ عصر کی نماز یہیں ہو گی۔ چنانچہ عصر کی نماز اسی میدان میں ہوئی۔ مردوں اور عورتوں نے نماز کے بعد دعا کی اور پھر ہم سب اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس ہوئے اس دن لوگوں کو معلوم ہوا کہ سیّد امانت حسین صاحب کی فیاضی کس کی بدولت تھی اور لوگ کس غلط فہمی میں تھے۔ سب تعریف اللہ کے لئے ہے صاحبِ کمال اور مالکِ کمال اللہ تعالےٰ ہی ہے وہ جسے چاہے اپنے کمال کا کچھ حصّہ دیدے۔

شیطان کا دربار

"اُف توبہ! یہ شعلے پھینکنے والے تودے، یہ دھواں دھار بگولے اور یہ بھیانک دامن کوہ! خدایا میں کہاں ہوں اور یہاں کیسے آ گیا؟"

میں نے آنکھیں ملیں۔ سوچا، خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں مگر نہیں میں کھلی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ دھواں دھار بگولے حرکت کرتے ہوئے شعلے اُگلنے والے تودوں میں سما گئے۔ پھر میں نے دیکھا جیسے آگ کے مجسمے تودوں پر بیٹھے ہوں۔ ایں! یہ تو جاندار معلوم ہوتے ہیں یہ تو آپس میں کچھ اشارے کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ خدایا یہ کون سی مخلوق ہے جنھیں میں دیکھ رہا ہوں۔ ان کے چہروں پر دھواں چھایا ہوا ہے ان کی آنکھیں انگارے برسا رہی ہیں ان کے جبڑے بھیڑیوں کے جبڑوں کی طرح ہیں لگتا تو یہ ہے کہ یہ انسان ہیں مگر یہ انسان کیسے؟

ایک گھبراہٹ اور خوف میرے دل پر چھا گیا۔ ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہونچا تھا کہ ان آگ کے تودوں پر بھیانک صورت والے جاندار مجسمے پکار اُٹھے:۔

"یا ابلیس پر تبلیس!"

اور پھر یکدم شور ہوا "زندہ باد!"

اوہ! یہ شیطان ہیں میرے دل نے کہا۔ میں سوچنے لگا کہ میں نے تو ابلیس پُر تبلیس پڑھا ہے۔ یہ پُر تبلیس کے کیا معنی ہیں؟ میں کچھ سمجھ نہ سکا میری نظر میں ایک بڑی پہاڑی کے تودے پر تھی جس پر ایک عظیم دھواں دھار بگولے سے نکل کر ایک مجسمہ حرکت کرتا ہوا جا بیٹھا۔ وہ سارے شیطانوں سے زیادہ ہیبتناک اور کریہہ تھا۔ نہ جانے کس طرح مجھے یقین ہو گیا کہ یہی ابلیس ہے۔ میں نے معوّذتین پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا اور یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ سب کیا کرنے والے ہیں؟۔

ابلیس پُر تبلیس یا میرے الفاظ میں تلبیس نے اپنا بھاری جبڑا کھولا۔ دھنوئیں کا ایک بگولہ اس کے منہ سے بھبکے کی طرح نکلا میں نے سنا۔

"ہاں! میرے ساتھیو! اپنی کارگزاری بتاؤ کیا کیا کارنمایاں کر کے آئے ہو آج جس نے سب سے بڑھ کر کام انجام دیا ہو گا اُسے میں اقلیم الشیطان میں اپنا نائب قرار دیدوں گا"

" ابلیس کے اشارے پر ایک طرف کا ایک تودہ جنبش میں آیا۔ میں نے دیکھا اس تودے پر سے ایک شیطان اُترا ابلیس کے سامنے آیا۔ مجرا بجالایا اور پھر اس طرح اپنی کارگزاری سنانے لگا۔

بسم الابلیس پر تبلیس۔

یوں تو آج میں نے بہت سے انسانوں، جی ہاں! آدم کے بیٹوں کو بہکایا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ آج میں نے ایک عابد کو غافل کر کے قعرِ مذلت میں گرا دیا۔

"ساتھیو! وہ عابد ایک جنگل میں خدا کی عبادت کر رہا تھا اچانک میں روشنی بن کر اس کے سامنے نمودار ہوا۔ میں نے روشنی میں سے پکارا" قبول قبول"! اے عبادت گزار بندے تیری عبادت قبول۔ اب تو اس مقام کو پہونچ چکا ہے کہ میں تجھ پر سے عبادت کے سارے ارکان کی پابندی ختم کرتا ہوں۔ اب تو جو چاہے کرے۔ تجھے جنت ملے گی"۔

یا ابلیس! یہ سُن کر وہ عابد چونکا۔ روشنی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ کون اسے پکار رہا ہے؟ میں نے سمجھ لیا۔ میں نے پھر کہا" میں کھلے چھپے بھیدوں کا جاننے والا ہوں۔ میں یہ بھی جاننے والا ہوں کہ تیرے دل میں کیا ہے۔ سُن! میں تیرا رب ہوں اور میں تجھ سے خوش ہو گیا۔ میری رضا کے سوا تجھے اور کیا چاہئیے؟"

یہ سُن کر اُس نے سامنے رکھی ہوئی کتاب اُٹھانی چاہی میں سمجھ گیا کہ یہ کتاب قرآن ہے میں نے سوچا اگر اس نے قرآن دیکھ لیا تو میرا داؤں خالی جائے گا اُسے جلد سے جلد کلام الہٰی سے غافل کر دینا چاہئیے۔ میں نے پُکارا۔

"اب قرآن کی تلاوت کی تجھے ضرورت نہیں۔ علم دین کے سارے خزانے میں تجھے ودیعت کرتا ہوں۔ اُٹھ اور اب جو چاہے کر"۔ تو جنت کا حقدار ہو گیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اُسے سوچنے دیا۔ بولا۔ تو میرا خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ خدا سے ہمکلام ہونے کا شرف تو انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کوئی جادوگر ہے یا شیطان"۔

اُف یا ابلیس پُر تبلیس! یہ سنتے ہی میں بوکھلا گیا۔ وہ تو خیر ہوئی اس نے "لاحول" نہیں پڑھی۔ مجھے جھٹ ایک داؤں سوجھ گیا اور میں نے اسی داؤں سے اس کو چت کر دیا۔ میں نے کھسیانی سی آواز بنا کر کہا:۔

"اے عابد! بے شک تو خدا کے کلام کا عالم ہے، اپنے علم کے زور سے بچ گیا ورنہ میں تیرے ایمان کو اُچک ہی چکا تھا"

یہ سنتے ہی عابد کی پیشانی چمک اُٹھی۔ غرورِ علم سے اس کی گردن تن گئی اور سینہ پھول گیا۔

بولا"۔ علم چیز ہی ایسی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا"۔

میں اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ عابد خوش خوش اُٹھا۔ بوریا لپیٹ کر ایک طرف چل دیا۔

میں پیچھے ہو لیا وہ اپنے معتقدین میں پہونچا اور ڈینگ مارنے لگا۔ "آج میں علم کی بدولت بچ گیا ورنہ شیطان مجھے اُچک لے جاتا۔" اور پھر اس نے سارا قصہ سب کو سنایا۔ سب اس کی تعریف کرنے لگے"۔

ساتھیو! میرا خیال ہے کہ میں نے اس کے اندر غرورِ علم بھر دیا۔ میں نے اسے اللہ کے فضل سے غافل کر دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک انسان کو اللہ کے فضل سے غافل کر دینا بہت بڑا کام ہے۔ یہ وہ باریک نکتہ ہے جسے میں نے بڑی محنت سے حاصل کیا۔ مجھے امید ہے کہ میرا یہ کام اس محفل میں اکرام کے لائق سمجھا جائے گا۔

میں نے دیکھا، جیسے ہی یہ شیطان چُپ ہوا۔ چاروں طرف سے اس کی تعریف ہونے لگی۔ لیکن ابلیس خاموش رہا اس نے دوسرے شیطان کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرا شیطان اپنی جگہ سے اُٹھا۔ ابلیس کے سامنے گیا۔ مجرا ادا کیا اور پھر ابتدائیہ کلمات کے بعد یوں اپنی رپورٹ سنانے لگا۔

"ساتھیو آج میں نے سب سے بڑا جو کام کیا ہے اس کی مختصر روداد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آج میرا گذر ایک مسجد میں ہوا۔ وہاں ایک نوجوان عالم درسِ قرآن دے رہا تھا۔ میں نے سُنا وہ کہہ رہا تھا۔ اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں ہے بلکہ مکمل نظامِ حیات ہے۔ اس نظام میں جہاں ایک طرف عبادت کے اصول ہیں اسی طرح سیاست کے قوانین بھی۔ اس نظام میں ایک طرف شادی بیاہ کے قاعدے بتائے گئے ہیں تو دوسری طرف لین دین کے ضابطے بھی۔ اس نظام میں گود سے لے کر گور تک اور مسجد سے میدانِ جنگ تک کے سارے طریقے موجود ہیں۔ لہٰذا صرف روزہ نماز ہی کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ فرائض میں سے ہے جو خدا نے حکم دیا ہے تو پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

نوجوان واقعی زبردست عالم معلوم ہوتا تھا۔ اس کا علم نیا تھا۔ میں نے سامعین پر نظر ڈالی۔ ایک طرف ایک چیں بجبیں شخص بیٹھا نظر آیا۔ میں نے اس کے کان میں پھونکا یہ تو کوئی مودودی معلوم ہوتا ہے۔"

بس پھر کیا تھا "چیں بجبیں" صاحب نے بڑے تیکھے پن سے کہا "جناب !

آپ کا تعلق کس جماعت سے ہے "

اور پھر آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ میں نے کیا کیا ہو گا۔ دیکھتے دیکھتے کچھ لوگ ایک کے طرفدار ہو گئے اور کچھ دوسرے کے اور پھر وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میری ضرورت نہیں رہی۔ وہ نوجوان عالم صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

یا ابلیس! میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی محفل کو درہم برہم کر دینا اس دین کو ڈھانا ہے جس پر آدم کے بیٹوں کو بڑا ناز ہے اُمید ہے کہ میرا یہ کام پسند کیا جائے گا۔

اس شیطان کے خاموش ہونے پر بھی چاروں طرف سے تعریف کے انگارے برسائے جانے لگے لیکن ابلیس اسی طرح چُپ بیٹھا رہا جس طرح بیٹھا تھا۔ اس نے ایک اور شیطان کی طرف اشارہ کیا اس نے ابتدائی کلمات کے بعد اس طرح کہنا شروع کیا۔

ساتھیو! آج میں نے بازار جا کر دیکھا۔ کچھ لوگ چندہ وصول کر رہے تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا یہ کس کے لئے چندہ ہو رہا ہے؟ بتایا کہ ایک گاؤں میں آگ لگ گئی ہے۔ دس بارہ گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ وہیں کے بے گھر لوگوں کے لئے امدادی رقم وصول کی جا رہی ہے۔

یہ سن کر میں آگے بڑھ گیا۔ حاجی اینڈ کو میں پہونچا۔ اپنے کو تاجر ظاہر کر کے حاجی صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں میں نے یہ سمجھ لیا کہ حاجی صاحب اپنی جیب سے ایک سو ایک ہزار روپیہ نکال چکے ہیں۔

میں نے حاجی صاحب کو سمجھایا کہ آپ زکوٰۃ تو نکالتے ہی ہوں گے۔ اس میں سے دو ہزار دیدیجئے۔ یہ ایک ہزار اصل کا بچ جائے گا۔

حاجی صاحب کو میری یہ بات پسند آگئی۔ انھوں نے نوٹوں کی گڈی صندوقچی میں ڈال دی اور اپنے منیم سے کہا کہ زکوٰۃ میں سے دو ہزار دے دینا اور یہ کہہ کر وہ ظہر کی نماز پڑھنے چلے گئے۔

تیسرے شیطان کے چُپ ہونے پر بھی مرحبا کے نعرے بلند ہوئے میں نے اپنے دل میں کہا:۔

"خدایا! ان شیطانوں کو کیسے کیسے باریک نکتے معلوم ہیں جن کے ذریعہ وہ انسان کو ایک عظیم ثواب سے محروم کر دیتے ہیں اور انسان ان کے دھوکے میں آجاتا ہے پھر میں نے اور بہت کچھ دیکھا سنا۔ ابلیس کے اشارے پر ایک ایک شیطان آتا اور اپنی اپنی کارگزاری سناتا۔ شیطانوں سے داد حاصل کرتا اور اپنی جگہ جا بیٹھتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ دیکھنا ہے ابلیس کو کس کی شیطنت پسند آتی ہے سب کے بعد ایک ٹھگنا شیطان ابلیس کے سامنے آیا۔ اس نے زیادہ تمہید سے کام نہیں لیا۔ آتے ہی بولا۔

"آج میں نے ایک مرد کو اسی کی بیوی سے لڑا دیا۔ یہاں تک کہ مرد نے بیوی کو گھر سے نکال دیا۔"

یہ ٹھگنا شیطان اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ ابلیس پکار اُٹھا" وہ مارا۔ ایں کار از تو آید

وشیطاں چنیں کنند۔ ہاں تو نے وہ کام کیا جو واقعی شیطانوں کے کرنے کا ہے۔ اچھا ہاں بتا کس طرح لڑا دیا تو نے دونوں کو ؟"

ٹھگنا شیطان بتانے لگا کچھ بھی تو زیادہ تدبیر کرنی نہیں پڑی۔ میں نے ایک تعویذ کچے دھاگے میں باندھ کر صدر دروازے کے بازو سے باندھ دیا اور ایک طرف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مالک مکان آیا۔ اس نے وہ تعویذ دیکھا تو پکڑ کر کھینچ لیا۔ تعویذ کو کھولا، تعویذ کا نقش اس طرح تھا:

ل	ف	ا	غ
رورا	یاعزازیل	ا	ا
ازغوث	ف	تازن	ف
ل	بیائد	نزدما	ل

وہ دیر تک یہ تعویذ دیکھتا رہا۔ اسے فکر مند دیکھ کر میں اس کے پاس گیا میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر وہ تعویذ کا نقش چھپا لیا۔ میں نے کہا "چھپانے سے کیا فائدہ ہے گھر کی خبر لیجئے"

اور یہ کہہ کر میں وہاں سے ہٹ گیا لیکن اس ٹوہ میں رہا کہ دیکھوں گھر میں کیا ہوتا ہے مالک مکان گھر میں گیا اور جاتے ہی اس نے بیوی سے پوچھا "غوث کو جانتی ہو"

بیوی نے جواب دیا "وہ میرا ماموں زاد بھائی، وہی تو ہے؟"

"جی ہاں، وہی۔ تو تشریف لے جائیے۔ وعا تعویذ ہونے لگے کہ میں غافل ہو جاؤں"۔ اور اس کے بعد "غیرت دار" مرد نے وہ بے نقط سنائیں کہ توبہ بھلی۔ لاکھ لاکھ بیوی نے قسمیں کھائیں لیکن مرد نے جھونٹے پکڑ کر اسے گھر سے نکال دیا۔

"یا ابلیس! میں سمجھتا ہوں کہ میں نے تھوڑی محنت کر کے کارِ عظیم انجام دیا"۔
یہ تو کوئی کام نہ ہوا۔ یہ تو ہر گھر میں ہوتا ہی ہے"۔ سارے شیطانوں نے کہا لیکن ابلیس اس ٹھنگنے شیطان کی شیطنت سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ پھر بولا۔ ایک مرد کو اس کی بیوی سے لڑا دینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسانوں کے معاشرے کی جڑ کاٹ دی گئی۔ اگر تم سب یہی ایک کام کر جاؤ تو انسان پر وہ عظیم فتح ہو گی جسے دنیا بھلا نہ سکے گی اور پھر اس میں وہ فتنہ برپا ہو گا جس کا روکنا انسان کے بس کا کام نہیں ہو گا۔"

یہ کہہ کر ابلیس نے نیابت کی سند اس ٹھنگنے شیطانوں کو عطا کی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر میں نے دیکھنا چاہا۔ لیکن اب وہ سب نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں آنکھیں کھولے اپنے بستر پر پڑا رہا۔ اچھا تو میں نے خواب دیکھا ہے۔ استغفر اللہ۔ اور پھر میں اپنے محلے کے زمن خان کو یاد کر کے افسوس کرنے لگا۔ اس بیوقوف نے ذرا سے شک پر بیوی کو طلاق دے دی تھی اور پھر خود بھی تباہ ہوا۔ اور اس کے بال بچے بھی۔ لَاحَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

۳۰۹ برس کے بعد

"لیکن اے قیصر! یہ تو آپ کی ایک عقلی دلیل ہے۔ ضروری نہیں کہ عقلی دلیل پر کوئی شخص اپنا دین دھرم تبدیل کر دے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری عقل ناقص ہے۔" حکیم صدوقی نے زچ ہو کر کہا۔

"مگر تم جیسے سمجھدار آدمی کے پاس اس عقلی دلیل کا کوئی توڑ نہیں"۔ قیصر روم تھیوڈوسیس نے کہنا شروع کیا۔ "کیوں حکیم! کیا وہ خدا جس نے ایک بار دنیا کو پیدا کر دیا اس کے لئے مشکل ہے کہ دوبارہ سارے جہان کو پھر بنائے"۔

"خدا کے لئے مشکل نہیں ہے"۔

"اچھا تم نے یہ تسلیم کر لیا۔ یہ بتاؤ کہ ایک شخص نے ستّر خون کئے اس نے نہ جانے کتنی عورتوں کو بیوہ کیا نہ جانے کتنے رشتہ داروں کو سوگوار کیا۔ نہ جانے کتنے بچوں کو یتیم کیا۔ کیا تم اس نقصان کا اندازہ لگا سکتے ہو"۔

"نہیں اے شہنشاہ!"

اس کے بعد وہ شخص گرفتار ہوا ہے اور ہیں نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا تو کیا اس کے

کرتوتوں کی اُسے پوری سزا مل گئی ؟ اسے پورا پورا بدلہ مل گیا ؟"

" نہیں !"

" تو پھر ضرورت ہے کہ ایک ایسا دن آئے جب پورا پورا انصاف کیا جا سکے اور کوئی پورے پورے نقصان کا اندازہ کر کے پوری پوری سزا دے سکے۔ بولو ضرورت ہے ایسے دن کی ؟ "

"................"

" حکیم ! تم چُپ کیوں ہو۔ جواب دو۔"

" حضور ! ضروری نہیں کہ ہر بات کا جواب دیا ہی جائے۔ حضور کو خدا نے بحث کا وہ ملکہ عطا فرمایا ہے کہ بڑے بڑے عاقل آپ کے سامنے عاجز ہیں۔ اگر کل خدا کسی ایسے بلیغ شخص کو پیدا کر دے جو بحث میں آپ کی زبان بند کر دے تو ؟"

" تو آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

" میری عرض وہی ہے کہ آج تک کسی شخص نے بھی آنکھوں دیکھی یہ دلیل نہیں دی کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندہ ہو سکتا ہے۔

" تو کیا خیال ہے تمہارا۔ ایک شخص آ کر یہ اطلاع دے کہ میں نے ملک چین دیکھا ہے تو تم جھٹلا دو گے۔"

" کیا معلوم وہ اپنا رعب قائم کرنے کے لئے یہ جھوٹ بول رہا ہو۔"

" لیکن اگر وہ کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ اور اس جھوٹ سے اس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔"

"حضور! میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ پھر مجھے اسی شخصیت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں جسے آپ نبی مانتے ہیں۔ میں تو یہ کہہ چکا کہ جو حضرت عیسیٰ کو نبی مانتا ہو اُسے آپ کی بات ضرور مان لینا چاہیئے۔ لیکن میرا جیسا شخص جو یہ کہتا ہے کہ جب تک کوئی واضح دلیل نہ ہو گی وہ آپ کے عقیدۂ آخرت کو کیسے تسلیم کرلے۔ دیکھئے میں آپ کو یاد دلادوں کہ آپ وعدہ کر چکے ہیں کہ آپ مجھے قتل نہ کریں گے۔ آپ نے اس اقرار کے ساتھ بحث چھیڑی ہے کہ دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے۔ آپ میرے سامنے واضح دلیل پیش کریں۔ میرا سوال پھر سُن لیجئے۔ آج تک کبھی نہیں دیکھا گیا نہ کہیں سنا گیا کہ کوئی مرکر پھر زندہ ہو سکتا ہے۔ تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں کہ مرنے کے مہینے دو مہینے کے اندر جسم سڑ جانے کے بعد پھر کسی کو زندگی مل سکی ہو۔ بحث و مناظرہ میں تو جسے اللہ نے زورِ بیان زیادہ دیا ہے وہ دوسرے کی زبان تو بند کر سکتا ہے مگر دل میں یقین نہیں پیدا کر سکتا۔ مجھے دل کا یقین چاہیئے۔"

شہنشاہ تھیوڈوسیس جو ۴۴۵ء میں روم کا مشہور قیصر گذرا ہے۔ حکیم کی اس منطق سے فکرمند ہو گیا۔ وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات پر پوری طرح ایمان لا چکا تھا۔ وہ اپنی ساری قوم اور رعایا سے توحید، رسالت اور آخرت کے عقیدہ کو منوا چکا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اُسے ایسی سمجھ دی تھی کہ وہ ہر ایک کو پوری طرح مطمئن کر دیتا تھا مگر حکیم صدوقی کو وہ مطمئن نہ کر سکا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو حکیم کے مطمئن نہ ہونے پر قوم اور رعایا پھر اپنے پہلے دھرم کی طرف پلٹ جائے۔ قیصر کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا

کہ وہ خدا سے مدد کا طلب گار ہوتا۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی۔ اچانک دربار کے باہر آواز بلند ہوئی۔

"مبرم مبرم والامرم یا قیصر!"

اور ساتھ ہی دربان نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ "لوگ ایک نوجوان کو چوری کے جرم میں پکڑ کر لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے پاس سے تین سو برس کے پہلے کا سکّہ برآمد ہوا ہے۔"

"اسے حاضر کرو۔" قیصر تھیوڈوسیس نے حکیم سے بحث کا سلسلہ روک دیا۔ اور اب وہ ایک جج اور منصف تھا۔ مجرم اور کوتوال اس کے سامنے پیش ہوئے۔ مقدمہ اس طرح شروع ہوا۔

کوتوال: "حضور! اس نوجوان کے پاس سے یہ سکّہ برآمد ہوا ہے۔ سیکڑوں آدمی گواہ ہیں۔"

قیصر: (سکّہ دیکھتے ہوئے) کیوں نوجوان! یہ سکّہ تمہارے پاس تھا۔"

نوجوان: "جی یہ سکّہ میرا ہے اور یہ میرا مال ہے۔ میرے پاس ایسا ہی سکّہ اور ہے۔"

قیصر: "دکھاؤ۔"

نوجوان: (دوسرا سکّہ پیش کرتے ہوئے) "یہ لیجئے۔ میں نے چوری نہیں کی اور نہ مجھے دفینہ ملا۔"

قیصر: "تم پر کبھی جنون تو نہیں ہوا۔"

نوجوان: "خدا کا شکر ہے کہ میں نہ کبھی مجنون تھا اور نہ آج ہوں۔ میں پورے شعور کے ساتھ اپنا بیان دے رہا ہوں۔"

قیصر: مگر یہ سکّہ ثابت کر رہا ہے کہ تم کو تین سو برس پہلے کا دفینہ ہاتھ لگ گیا ہے اور تم جانتے ہو کہ ہر دفینہ سرکاری ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ تمہیں اس کا خمس (پانچواں حصّہ) مل جاتا لیکن تم نے چھپایا اس لئے تم مجرم ہو۔"

نوجوان: "میں مجرم کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں نے بھرے بازار میں باورچی کو پورے اطمینان سے یہ سکّہ دیا۔ اگر مجھے چھپانا ہوتا تو مجھے اسے گلا ڈالنا چاہئے تھا۔"

قیصر: "تم بڑے نڈر نوجوان معلوم ہوتے ہو لیکن تم یہ بھول لیتے ہو کہ اس سکّے پر تین سو برس پرانا ٹھپّہ ہے۔"

نوجوان: (بوکھلا کر) تین سو برس، تین سو برس۔ خدائے واحد کی قسم میں اور میرے دوست تو پرسوں یہاں سے گئے ہیں۔"

قیصر: "تم کیا کہتے ہو۔ پرسوں جانے کے کیا معنی ہیں۔"

نوجوان: "........."

قیصر: "تمہاری خاموشی، تمہارا خوفزدہ چہرہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم چور ہو۔"

نوجوان: "میں چور نہیں ہوں۔ میں اس سکّے کی وجہ سے نہیں ڈر رہا ہوں۔"

قیصر: "پھر صاف جواب دو، تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔"

نوجوان: "(جھنجھلا کر) اگر حضور نے انصاف کیا ہوتا تو ہم ساتوں دوست کیوں اپنی

جان بچا کر بھاگ گئے۔"

قیصر: (کوتوال سے) اس نوجوان کی پچھلی رپورٹ تمہارے پاس ہے۔"

کوتوال: "میں بالکل ناواقف ہوں۔"

قیصر: (نوجوان سے) "پرسوں تم کیوں بھاگ گئے تھے۔"

نوجوان: (چاروں طرف حیران و پریشان ہو کر دیکھتا ہے)۔

قیصر: "تم پریشان نہ ہو۔ اپنا بیان دو، تم پر ظلم نہ ہوگا۔"

نوجوان: "اگر آپ میری جاں بخشی فرمائیں اور کہنے دیں تو عرض کروں۔"

قیصر: "میں خدائے واحد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو قتل نہ کروں گا۔"

نوجوان: "خدائے واحد، خدائے واحد، عیسیٰؑ، عیسیٰؑ۔ خدایا! میں کیا سُن رہا ہوں ایک دن میں یہ کیا ہو گیا۔ پروردگار تیرے بس میں سب کچھ ہے۔"

قیصر: "نوجوان، تم پر یہ حیرانی کی کیفیت کیوں طاری ہے۔ اپنا بیان دو۔"

نوجوان: "تو کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے خدا کو ایک تسلیم کر لیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ کو نبی مان لیا۔"

قیصر: "بے شک! میرا یہی ایمان ہے۔"

نوجوان: "الحمد للہ، یہی میرا وہ جرم تھا جس کی وجہ سے ہم ساتوں دوست پرسوں یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ یہ کوتوال صاحب جو آج کہتے ہیں کہ ہم سے ناواقف ہیں۔

ان کے جاسوس ہماری تلاش میں تھے لیکن ہمارے خدا نے ہمیں حفاظت کی جگہ پہونچا دیا۔

قیصر، حکیم صدوقی اور سارے درباری حیران تھے کہ یہ کیسا نوجوان ہے اور کون ہے اور کیسی باتیں کر رہا ہے۔ سب بڑے دھیان اور نہایت دلچسپی کے ساتھ مقدمہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

قیصر: (نوجوان سے) "تم اپنا پورا واقعہ سناؤ ورنہ جرم کا اقرار کرو۔"

نوجوان: "اب مجھے کیا خوف ہو سکتا ہے۔ اب تو میں اپنا پورا تعارف کرا سکتا ہوں سنئے۔ میرا نام ملیخا ہے۔ میں صدروس کا بیٹا ہوں اور محلے خدریس کا رہنے والا ہوں۔ آپ میرے باپ کو بلا کر دریافت کر سکتے ہیں کہ میں چور نہیں۔ آپ میرے محلے والوں سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے کبھی چوری نہیں کی۔ میں نے جو سکہ پیش کیا ہے۔ یہ وہی سکہ ہے۔ جو میں پرسوں لے کر گیا تھا۔ ایک دن کے اندر آپ نے یہ سکہ ناجائز قرار دے دیا آپ نے بہت اچھا کیا۔ جب ایک دن میں آپ کا ایمان، آپ کا یقین، آپ کا دین بدلا تو سکہ بھی بدل جانا چاہئے۔

آپ میری باتوں پر تعجب میں کیوں ہیں۔ آپ ہی کے حکم سے کوتوال ہمارے پیچھے لگا تھا کہ ملیخا اور اس کے دوستوں کو پکڑ لاؤ۔ جرم یہی تھا جو آج آپ کا ایمان بن چکا ہے۔ میں نے ان سارے ہاتھ کے بنائے ہوئے خداؤں اور اپنی جگہ پر طاغوت بن کر بیٹھنے والوں کی خدائی سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی

نبوت کی گواہی دی تھی۔ پرسوں۔ بس یہی میرا جرم ہے کہ آپ ناراض ہو گئے۔ آپ تو خود خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج آپ مسلمان ہیں۔

اے شہنشاہ! میں نے اور میرے نوجوان دوستوں نے کھلم کھلا یہ اعلان کیا تھا کہ ہمارا رب قیصر ڈیسیس (یعنی آپ) نہیں، بلکہ وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے (قیصر ڈیسیس کا نام لیا گیا تو شہنشاہ تھیوڈوسیس اور درباریوں کو اور بھی حیرت ہوئی) ہم نے آپ کو رب تسلیم نہیں کیا تو آپ نے ہمیں گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ جب ہم ساتوں نے آپ کا حکم سُنا تو ہم نے طے کر لیا، کچھ بھی ہو ہم اللہ تعالےٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو معبود نہ بنائیں گے اگر ہم ایسا کریں تو بہت بے جا بات ہو گی۔ پھر ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہماری قوم تو اللہ ربِ کائنات کو چھوڑ چکی ہے اور اس کے پاس کوئی مضبوط دلیل بھی نہیں ہے۔

اے شہنشاہ! اب مجھے یہ کہنے میں کیا ڈر ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم اور ناسمجھ کون ہو سکتا ہے جو ایک خدا کے سوا دوسروں کو اپنا رب بنائے۔ اور حضرت عیسیٰ کو نبی نہ مانے۔

اے بادشاہ! ہم نے ذرا جلدی کی۔ اگر ہم ایک دن اور صبر کرتے تو آپ کا مسلمان ہونا دیکھتے۔ ہم اپنی غلطی کی اپنے رب سے معافی مانگتے ہیں۔ ہم نے مشورہ کر کے راہِ فرار اختیار کی۔ ایک غار میں جا چھپے۔ اللہ کو رازق ہم مان چکے تھے۔ ہمیں یقین تھا اللہ تعالیٰ ہمیں روزی دے گا۔

اے بادشاہ! جس وقت ہم نے یہ اعلان کیا اور بھاگے جا رہے تھے تو راستے میں ہمیں ایک وفادار کُتّا ملا۔ وہ ہمارے پیچھے چلا۔ ہمیں کھٹکا پیدا ہوا کہ اگر یہ ساتھ رہا تو ہمارا بھید کھل کر رہے گا۔ ہم نے اُسے ڈھیلے مارے۔ اسے بہت بھگایا۔ لیکن وہ پیچھے لگا رہا۔ حیرت یہ تھی کہ وہ بھونکتا نہ تھا۔ ہمیں اس کی حالت پر رحم آگیا۔ ہم نے اُسے ساتھ لے لیا اور غار میں جا چھپے۔ وفادار کُتّا غار کے منہ پر اگلی ٹانگیں پھیلا کر سو رہا۔ گویا اس نے بتایا کہ پہلے اُسے کوئی قتل کر دے پھر سات دوستوں تک پہونچے ـــ (نوجوان نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے حکیم صدوقی کی طرف انگلی اُٹھائی) حضور! اس دربار میں دیکھتا ہوں کہ یہ بزرگ سب سے زیادہ سمجھدار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ایک جانور نے ہماری مدد کی۔ افسوس ہے انسان پر کہ وہ عیسیٰؑ کو نبی نہ مانے۔

(نوجوان نے یہ کہا تو حکیم صدوقی گھبرا گیا اور سارا دربار مسکرانے لگا) اس کے بعد ہم دوسرے دن جاگے تو آپس میں کہنے لگے کہ بھلا کتنی دیر سوئے ہوں گے؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم ہی سوئے ہوں گے۔ پھر ہم نے خود ہی کہا کہ ہمارا اللہ بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ پھر ہم کو بھوک لگی رائے یہ ہوئی کہ ہم اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکّہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ جا کر دیکھے سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔

میں آپ سے یہ بھی عرض کر دوں کہ ساتوں ساتھی کھاتے پیتے خاندان سے تعلق

رکھتے ہیں۔ سیلیخا جو ان میں سب سے بڑا ہے وہ آپ کے مصاحب کیموس کا لڑکا ہے۔ آپ کیموس سے دریافت کریں کہ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ اور کیموس کی کرسی آپ کے دربار میں وہ ہے (نوجوان نے مڑ کر ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا لیکن پھر وہ ہکّا بکّا رہ گیا اور بولا۔ تعجب ہے آج کیموس کی کرسی پر دوسرا شخص بیٹھا ہے) حضور معلوم ہوتا ہے کہ کیموس قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ در پردہ ہمارا ہمدرد تھا۔ کاش کہ ایک دن اور اُسے زندگی مل گئی ہوتی۔ خیر۔ آگے ہمارا حال یہ ہے کہ مجھے چنا گیا کہ میں بازار جا کر کھانا لاؤں۔ میں نے چاندی کے سکے جیب میں ڈالے اور کسی سے بات کئے بغیر باورچی کی دوکان پر پہونچا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہے کہ ایک دن میں شہر کی کایا پلٹ ہوگئی۔ آج یہ شہر وہ شہر ہی نہیں جو پرسوں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک دن میں یہ کیسے کیا ہوگیا شائد کوئی معجزہ آپ نے دیکھا اسی لئے آپ حضرت عیسٰیؑ پر ایمان لائے۔ ورنہ دلیلوں سے تو کوئی ماننے والا نہیں۔ انسان کج فہم واقع ہوا ہے خیر۔

میرے ساتھیوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ بڑی ہوشیاری سے جانا۔ اگر پہچان لئے گئے تو ہماری خیر نہیں۔ ہم سب سنگسار کر دئے جائیں گے یا پھر یہ ہوگا کہ ہمیں پکڑ کر پھر اس دین اور دھرم کی طرف لانے پر مجبور کیا جائے گا جسے باطل سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔

میں بڑی ہوشیاری سے شہر میں آیا۔ میں نے جیسے ہی سکہ باورچی کو دیا۔ اس نے شور مچا دیا۔ کوتوال صاحب آپہونچے۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے اُمید ہے کہ اب جبکہ

آپ خود حضرت عیسیٰؑ کو نبی تسلیم کر چکے آپ ہمارے ساتھیوں کا اعزاز فرمائیں گے۔ آپ مجھے حکم دیں تو میں اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو جاکر یہ خوشخبری سناؤں اور یہاں لے آؤں۔

نوجوان اپنا بیان دے کر خاموش ہو گیا۔ قیصر تھیوڈوسیس اور درباری سب حیران تھے کہ نوجوان یہ کیا باتیں کر رہا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ "نوجوان تم اپنا محلہ، اپنا مکان اور اپنے خاندان والوں کو پہچان لو گے؟"

"کیوں نہیں!"

اور پھر قیصر سارے درباریوں اور حکیم صدوقی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ آگے آگے نوجوان ایک طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ وہ راستوں اور عمارتوں کو دیکھ کر ششدر ہو رہا تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا۔ "خدایا! ایک دن میں یہ کیسا معجزہ ہو گیا کہ شہر کی ہر چیز بدل گئی۔ وہ چلتے چلتے ایک عالی شان محل کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس محل کی بنیاد پرانے پتھروں کی تھی۔

"اس جگہ تھا میرا مکان مگر یہ محل نہ تھا۔ میں نے بنیاد کے پتھروں سے پہچانا۔" نوجوان نے محل وقوع بتا دیا۔ بادشاہ اور درباریوں کو دیکھ کر اہل محلہ جمع ہو گئے۔ صاحبِ مکان بھی گھبرا کر باہر نکل آیا۔ ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر سب حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے مکان کے سارے افراد بچے بوڑھے جوان مرد اور عورتیں سب نوجوان کے سامنے لائے گئے اور نوجوان ہر ایک کو دیکھ کر کہتا رہا

کہ میں اسے نہیں پہچانتا۔ گھر کے ایک پیرِ ضعیف نے ڈرتے ڈرتے بادشاہ سے پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ہمارے گھر کے افراد کی جانچ پڑتال کیوں ہو رہی ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم شریف شہری ہیں اور ہم نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا ہے۔

نوجوان خاموش کھڑا تھا۔ اب اُسے ڈر لگنے لگا کہ وہ اپنا تعارف ٹھیک ٹھیک نہ کرا سکا۔ ضرور قتل کر دیا جائے گا۔ بادشاہ نے بھانپ لیا اس نے کہا۔

"نوجوان ڈرو نہیں۔ تم نے اپنے باپ کا نام کیا بتایا تھا؟"

"صدروس!"

بادشاہ نے اس پیرِ ضعیف سے پوچھا، "تم اس نام سے واقف ہو؟"

پیرِ ضعیف: حضور! صدروس میرے پردادا کا نام تھا۔"

قیصر: "تمہارے پردادا کو کتنا زمانہ ہوا؟"

پیرِ ضعیف: "لگ بھگ تین سو برس۔"

قیصر: تمہارے پاس شجرۂ نسب ہے؟"

پیرِ ضعیف: "جی حضور! ہم شجرۂ نسب کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

قیصر: "تم نے اپنے دادا کو دیکھا ہے؟"

پیرِ ضعیف: "جی دیکھا ہے۔ میں نوجوان تھا جب وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔"

قیصر: "تمہارے دادا کا کوئی اور بھائی بھی تھا۔"

پیرِ ضعیف: جی نہیں، وہ اکیلے تھے۔ میں ان کا پوتا ہوں اور ان کا جائز وارث

اگر کوئی اور دعویٰ دار ہے تو وہ یقیناً ہماری جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتا ہے"۔

قیصر: "تم گھبرا کیوں گئے۔ اس نوجوان کو دیکھو، یہ کہتا ہے کہ میں صدروس کا بیٹا ہوں اور اس مکان کا مالک"۔

پیرِ ضعیف: ہی ہی ہی ہی۔ حضور! ہم سے بذلہ سنجی فرماتے ہیں۔ ہمارے لئے آپ کی بذلہ سنجی باعثِ فخر ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ یہ نوجوان یقیناً پاگل ہے"۔

قیصر: "بڑے میاں! سنجیدہ بنو۔ جو پوچھا جائے صاف صاف بتاؤ۔ اپنا شجرہ نسب لاؤ"۔

پیرِ ضعیف: "بہت اچھا حضور! پیرِ ضعیف نے گھر کے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ جاکر شجرہ لے آیا۔ بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا۔

قیصر: "یہ دیکھو بڑے میاں! تمہارے دادا کے نام کے برابر کس کا نام لکھا ہے؟"

پیرِ ضعیف: "(شجرہ دیکھ کر) مگر حضور ملیخا، میرے دادا کا بھائی تو لاپتہ ہو گیا تھا وہ تو عیسیٰؑ پر ایمان لانے کے جرم میں معتوب بارگاہ تھا۔ اس لئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ یہ نوجوان ملیخا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تنہا اپنے دادا کی جائیداد کا وارث ہوں اور یہ نوجوان مجنوں ہے"۔

قیصر: (اپنے وزیر آثار قدیمہ سے) "کیا تم بتا سکتے ہو کہ تین سو برس پہلے کس قسم کا لباس پہنا جاتا تھا"۔

وزیر: میں اپنی واقفیت کی بناء پر پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ

اس نوجوان کا وہی لباس ہے۔

پیرِ ضعیف : " حضور یہ نوجوان وزیر صاحب سے ملا ہوا ہے اور غاصبانہ ہماری جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ یہ نوجوان تین سو برس گزرنے پر نوجوان ہی رہا۔

قیصر : وہ تو یہی کہتا ہے اور ثبوت میں اپنے ساتھیوں کو پیش کرتا ہے"۔

پیرِ ضعیف : اگر وہ یہ ثابت کر دے اور ایک عقلمند آدمی مان لے تو میں اسے اس کا حق دیدوں گا۔

قیصر تھیوڈوسیس نے حکم دیا کہ کسی تاخیر کے بغیر غار کی طرف چلنا چاہیئے۔

وہ اپنے درباریوں، حکیم صدوقی اور ملیخا کے گھر والوں اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ ملیخا کی رہنمائی میں غار کی طرف چلا۔ غار کے پاس پہونچا تو کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ ملیخا اسی طرف بڑھ گیا۔ سارا مجمع اس کے پیچھے تھا سب غار کے پاس پہنچے ملیخا نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر ملیخا اندر گیا۔ اس کے ساتھی پریشان تھے انھوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ واقعی ہم سب پہچانے گئے۔ آؤ دعا کریں کہ اے اللہ جب ہمیں پھانسی دی جائے تو ہم ثابت قدم ہوں۔ اے اللہ! ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں اس حالت میں موت آئے کہ ہم مسلمان ہی ہوں۔

ملیخا نے سب کو دلاسا دیا۔ حال بتایا اور کہا کہ نہ جانے کیا معجزہ ہوا کہ ایک

دن میں شہر اور شہر والوں کی کایا پلٹ گئی۔ پھر اس نے ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ بادشاہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

"نہیں نہیں ملیخا! تم کو دھوکہ دیا گیا۔ اس طرح دھوکے سے بادشاہ ہمیں پکڑنا چاہتا ہے۔"

"ملیخا نے سب کو سمجھایا اور آخر کار سب کو غار کے باہر لے آیا۔ بادشاہ سب سے ملا حال پوچھا۔ سب نے کہا کہ ملیخا نے جو بیان دیا ہے وہی ہمارا بیان ہے۔ لیکن اب ہم اس غار سے باہر جانا نہیں چاہتے۔ ہمیں پھر نیند لگی ہے۔ اور یہ کہہ کر سلیخا نے ملیخا کا ہاتھ پکڑا اور اندر جا کر سب لیٹ گئے اور لیٹتے ہی سو گئے۔ پھر لاکھ آوازیں دی گئیں لیکن وہ نہ جاگے۔

اب بادشاہ حکیم صدوقی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "فرمائیے اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

حکیم صدوقی کو عینی دلیل مل گئی تھی۔ اس نے اقرار کیا کہ حضرت عیسیٰؑ نبی برحق ہیں اور آخرت کا دن بھی برحق ہے۔

شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے غار کو تیغاں کر دیا گیا۔ پتھر چنوا دیئے گئے اور کندہ کرا دیا گیا کہ یہ ان سات نوجوانوں کی یادگار ہے جو اب سے تین سو برس پہلے اس جرم میں وطن سے بھاگ گئے تھے کہ انھوں نے اللہ کو ایک اور عیسیٰ کو اللہ کا نبی مانا تھا۔ اور ان کا عقیدہ تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ہر ایک کو خدا

کے حضور اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اور میں اور حکیم صدوقی اور میری رعایا گواہ ہے کہ یہ ساتوں ۳۰۹ برس تک اس غار میں سوتے رہے اور پھر میں نے ان سے ملاقات کی۔

(تھیوڈوسیس قیصر روم ۴۴۵ء)

میں یہ کچھ لیکن ؟

چائے پیتے پیتے اچانک مجھے وہ بات یاد آ گئی اور میں اُسے کہہ دینے کے لئے بیتاب ہونے لگا۔ آخر میں نے پاپا سے کہہ ہی دیا۔

"آپ کو ایک بات بتا دوں ؟"

"ضرور۔ لیکن اپنی امّی کی شکایت کرنی ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ۔ انھیں اپنے کان بند کر لینے دو۔" پاپا نے کہتے کہتے ممّی کی طرف دیکھا اور ممّی بُرا سا منہ بنا کر میری طرف دیکھنے لگیں میں نے کہا۔

"نہیں پاپا، میں شکایت نہیں کروں گا۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ آج دوپہر کو وہ آئے تھے"

"وہ کون ؟" پاپا نے پوچھا۔

"وہی، امّی کے وہ!" اور میں نے انگلی اپنے سر پر اس طرح گھمائی جیسے میں بتا رہا تھا کہ جن کے سر پر جٹائیں ہیں اور پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر منہ جو پھیلایا تو پاپا ہنس پڑے، بولے:

"اچھا میں سمجھ گیا۔ ممّی کے وہ! تو پھر کیا باتیں ہوئیں اور کتنی وکشنا بھینٹ

کی گئی ان کو ؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ ممّی سے ہی پوچھئے!"

" اگر ان کی طرح ہندوستان کی ساری عورتیں سادھوؤں پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے لگیں تو لوگ انجینئرنگ اور ڈاکٹر بننے کے بجائے سادھو بننے کی ٹریننگ لینے لگیں گے اور داڑھی مونچھ منڈوانے کے بجائے جٹادھاری ہو جائیں گے۔" پاپا نے ممّی پر بھرپور طنز کیا لیکن ممّی نے بُرا نہ مان کر اس طرح پاپا کو سمجھایا:-

" دھرم کی باتوں میں مذاق نہیں کرتے۔ وہ واقعی پہنچے ہوئے مہاتما ہیں۔ کتنا صحیح صحیح بتاتے ہیں آگے کا حال۔"

" ان سے زیادہ جوتش میں جانتا ہوں ممّی!" میں جھٹ بول پڑا۔ ممّی نے گھور کر مجھے دیکھا۔ بولیں:-

"وہ کیسے ؟"

" لاؤ ممی! دکھاؤ اپنا ہاتھ۔ ایسی ایسی باتیں بتاؤں جو سولہ آنے ٹھیک ہوں۔" میں نے ممّی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

" چل ہٹ! تو چُپ چاپ چائے پی۔"

" آپ میرے جوتش کی قدر نہیں کرتیں۔ خیر کوئی بات نہیں اری الکا! لا تیرا ہاتھ دیکھوں!" میں نے اپنی چھوٹی بہن کا ننھا منّا ہاتھ پکڑ لیا۔

" ہاں تو الکا!"............ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ تیرا ہاتھ دیکھ کر بھید کی

بات بتاؤں گا۔"

"کیا ہ" پاپا اور ممّی ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔

" الکا! تو اپنی ممّی کی بیٹی ہے" پاپا زور سے ہنسے۔ممّی بھی مسکرانے لگیں لیکن ان کے تیور کہہ رہے تھے کہ تو سادھوؤں کی ہنسی اُڑاتا ہے اور الکا ممّی کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ ان سے میری بات کی تصدیق کرانا چاہتی ہو۔

" اوّل مے لی اُمل ہ" پھر الکا نے مجھ سے پوچھا۔

" ارے ہاں تیری عمر تو بتانا بھول ہی گیا۔"

" بتاؤ ـــ"

" بالکل سچی بات بتاؤں!"

" دیکھ اوٹ پٹانگ نہ بکنا۔" ممّی نے ہدایت فرمائی

" سچ بات کہنے سے کیا ڈرنا۔کیوں نہ پاپا!" میں نے پاپا کی طرف دیکھا اور انھوں نے سر ہلا کر" ہوں" کرتے ہوئے میرا حوصلہ بڑھایا۔میں نے کہا:۔

" ہاں تو الکا! تیرے ہاتھ کی ریکھا بتاتی ہے کہ جب تک تو زندہ ہے تب تک نہ مرے گی۔!"

یہ سُن کر الکا بہت خوش ہوئی اس نے جیب سے ایک پیسہ نکالا اور کہا لو بابو جی دچھنا!" اور پاپا اور ممّی دونوں ہنس پڑے۔میں نے پیسہ لیتے ہوئے پھر کہا۔

" دیکھ الکا! جوتشی جو کچھ کہتا ہے، وہی ہوتا ہے، جیسے سادھو بابا نے

بتایا کہ پاپا کی ترقی اسی وقت ہو گی جب ایک چھوٹا موٹا یگیہ کیا جائے گا۔" میں نے بھید بتادیا اور پاپا سُن کر بوکھلا گئے۔

"کیوں جی! یہ سادھو کیا میرا "صاحب" ہے جو مجھے ترقی دے گا؟"

"صاحب نہ سہی، صاحب کا کچھ لگتا ہو گا۔ کیوں نہ ممی!" میں نے بھولا بن کر کہا۔

"یہ کیا، تمہارے کارن بچے بھی میرا مذاق اُڑانے لگے۔" ممی نے جھنجھلا کر کہا۔ "اپنا اپنا عقیدہ اور وشواش ہے۔ پھر میں جو کچھ کرتی ہوں، تم لوگوں کے بھلے ہی کے لئے تو۔ اچھا اب یہ بکواس بند ہونی چاہیئے۔"

"بک بک خود کرتی ہو" پاپا زور سے بولے۔ اسی وقت الکا بول اُٹھی۔

"پاپا چھما کوکئے لیا تا۔ ماں باپ کو بچّوں کے چھامنے للنا نئیں چاہیئے۔ بچّوں پَل بلا اُچھل پلتا ہے۔"

"اس نے یہ بھی کہا ہو گا کہ جب ماں باپ لڑتے ہوں تو بچوں کو آنکھیں بند کر لینا چاہیئے۔ چلو تم دونوں اپنی آنکھیں بند کرو۔" پاپا نے ڈانٹ پلائی۔

"ارے ہاں۔ باتوں میں بھول ہی گئی۔ ارے او سمارو! ادھر آنا ذرا!" ممی نے نوکر پکارا۔

"آیا بائی صاحب" کہہ کر سمارو سامنے آیا تو ممی نے کہا "تھوڑا سا گاجر کا حلوہ سادھو بابا کو دے آنا ان کی کٹیا پر۔"

"اور ان کا سامان ہے" سمارو نے یاد دلایا۔

"میں نے چھ روپے دیدئے ہیں۔ وہ خود انتظام کرلیں گے۔ تو جا ذرا جلدی نہیں تو سورج ڈوب جائے گا۔"

سمارو رسوئی (باورچی خانے) کی طرف چلا گیا۔ پاپا نے بڑی متانت سے پوچھا۔

"کتنے روپے دئیے ہیں اس کو؟"

"صرف بیس روپے۔"

"یعنی بیس روپے میں مجھے ترقی دلواؤ گی؟"

"ترقی کی بات نہیں۔ سادھو بابا کے مندر میں ایکادشی کے دن کیرتن ہونے والا ہے۔ دھرم دھیان کے لئے میں نے بیس روپے بھینٹ کئے تو کیا غضب ہو گیا!"

میں نے جلدی جلدی چائے پی۔ اس کے بعد کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے کھیلنے جانا ہے۔

سمارو نے ایک پلیٹ تیار کرلی تھی۔ وہ مجھ سے تین چار ہی برس بڑا تھا۔ یہی بیس اکیس سال کا۔ ممّی اس کو اس لئے پسند کرتی تھیں کہ وہ روز سویرے پوجا پاٹ کرلیتا تھا۔ ایک سال ہونے کو آیا جب سے وہ ہمارے گھر کام کرتا ہے۔ ممّی کے چھوٹے سے پوجا گھر (عبادت خانہ) کا پجاری بھی وہی تھا۔ پہلی بار جب سادھو بابا ہمارے گھر آئے تھے تو سب سے پہلے سمارو نے ہی لیٹ کر انھیں ڈنڈوت کی تھی۔ ممی نے جب یہ دیکھا تو وہ کھل اٹھیں ان سادھو بابا سے ممی کو اتنی عقیدت کیوں تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے ممّی کے خاندان کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں آپ کے خاندان والوں کو

اس لئے جانتا ہوں کیونکہ میرے پر دادا اپنے زمانے میں آپ کے خاندان کے پروہت تھے۔ دھرم سے متعلق سارے کام انہی سے کراتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ تین پیڑھیوں کے بعد پھر وہی رشتہ قائم ہو رہا ہے۔

بابا نے جو کچھ بتایا تھا وہ سب ٹھیک تھا۔ میں بھی بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ بابا مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ سمارو ان کے پیر دبا رہا تھا۔ بعد میں میں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ وہ مجھے سمجھانے لگا "سادھو کی سیوا کرنے سے سورگ ملتا ہے"۔

سمارو کی اور سبھی باتیں مجھے اچھی لگتی تھیں مگر جب وہ پنڈتائی جتاتا تو میری تیوریاں چڑھ جاتیں۔

اب باباجی ہر ہفتہ ہمارے یہاں آنے لگے۔ ممی ان کو ہر تیوہار پر بھوجن کراتیں ایک بار باباجی آتے ہی بولے "بیٹی تم اُداس سی لگتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی چِٹھی آئی ہے جس میں کوئی بری بات ہے"۔

ممی چونک پڑیں اور بڑی حیرت کے ساتھ باباجی کو دیکھنے لگیں "آپ نے ٹھیک کہا بابا!"

"تم کو اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے بڑی چنتا ہے"۔

"ہاں بابا! یہی بات ہے۔ تو کیا میں میکے جاؤں"۔

"اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں"۔

ایک بار سادھو بابا میرے گھر آئے تو مجھ سے بولے "تم کو اپنی عادتیں ٹھیک

کرلینی چاہئیں۔ تم نے سمارد کے بلاوجہ طمانچہ مارا تھا۔ اس طرح غصّہ کرنے سے انسان پاپ میں بندھ جاتا ہے۔"

پاس ہی کھڑا ہوا سمارو اچانک گڑگڑا کر بولا۔" باباجی! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ میں نے اس کا بُرا نہیں مانا۔ پھر............ ؟"

"سادھوؤں سے کیسے چھپ سکتا ہے ؟"

"لیکن باباجی! ہمارے گھر کی باتیں آپ کو کیسے معلوم ہو جاتی ہیں ؟"

"بٹیا! تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ میں تمہارے گھر کا پروہت ہوں۔ تم سب کی جنم کنڈلیاں میرے پاس ہیں۔ میں جوتش کا وِدّوان ہوں۔ یوگی ہوں۔ تمہارا سب کا حال میں کیسے نہ جانوں گا۔"

میں حیران تھا جب معمول رخصت کرتے ہوئے اس بار بھی امّی نے دس کا نوٹ انھیں بھینٹ کیا تھا۔ میں نے یہ بات پاپا کو بتائی اور ان سے پوچھا" باباجی کس طرح ہمارے گھر کی ساری باتیں جان لیتے ہیں ؟" پاپا نے میرے سوال کا جواب تو نہیں دیا۔ ہاں یہ ضرور کہا کہ" اب بہت سنبھل کر رہنا ہو گا۔ نہ جانے باباگھر کی کس چیز پر اُنگلی رکھ دے اور تمہاری ممی وہ چیز اُسے دے دیں۔"

اس کے بعد شام کو ممّی نے پاپا سے کہا۔" وہ کہہ رہے تھے کہ اس ہفتہ میں کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔"

حادثوں کی تو ہمارے گھر باڑھ آئی ہے۔ باباجی ایک حادثے کو کہتے ہیں۔"

"ہمارے گھر بھگوان کی بڑی کرپا ہے۔ حادثے ہمارے یہاں کیا ؟"

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ ایک بڑا حادثہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ اگر میں ان بابا لوگوں کے بارے میں کچھ تم کو بتاؤں تو گھر میں فساد برپا ہو جائے۔"

ممّی نے بُرا سا منہ بنایا لیکن پھر صبح پاپا کو منہ بنانا پڑا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ صبح کو ناشتہ کچھ ٹھیک سے نہ بنا تھا۔ نہ چائے اچھی لگ رہی تھی اور نہ پوریاں۔ پاپا کچھ یونہی سا کھا پی کر دفتر چلے گئے۔ دوسرے دن دودھ والے نے حسبِ معمول جب صبح کو کال بیل دبائی تو ممّی دروازہ کھولنے گئیں۔ دروازہ کھلا دیکھ کر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "میں تو کنڈی لگا کر سوئی تھی"۔ ان کی زبان سے نکلا۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ دروازے کی بغل میں سمارو بندھا پڑا ہے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا ہے تو چونک سی پڑیں اور انھیں خطرہ محسوس ہونے لگا۔ ممّی نے ہڑبڑا کر پاپا کو جگایا اور پھر گھر کی ہر چیز دیکھی جانے لگی جہاں سمارو سوتا تھا۔ وہیں بغل میں میری سائیکل کھڑی رہتی تھی۔ سائیکل اب وہاں سے غائب تھی۔ میں نے سمارو کے منہ سے کپڑا نکالا تو وہ رو پڑا۔ اس نے بتایا کہ رات میں چور آئے تھے۔

ادھر ممّی نے کہا۔ "دالان میں سلائی مشین رکھی تھی۔ وہ نہیں ہے۔ رسوئی کے برتن نہیں ہیں۔ ممّی تو جیسے پاگل ہو گئی تھیں۔ خیریت یہ تھی کہ جن کمروں میں ہم سوتے تھے وہاں چور نے ہاتھ نہیں مارا تھا۔ باورچی خانہ ہمارے کمرے سے الگ تھا۔ بس چوروں کا چھاپا کمرے سے باہر ہی پڑا۔

پاپا نے فوراً گیرج سے کار نکالی اور تھانے کی طرف چل دئیے۔ محلّے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ میں نے بھی سمارو سے واردات کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ معلوم ہوا کہ چور چھت پر سے صحن میں اُترے پھر سب سے پہلے مجھے بے لبس کر دیا۔ اس کے بعد کنڈی کھول کر جو لے جانا تھا لے گئے۔ پاپا لوٹے تو ان کے ساتھ تھانیدار صاحب بھی تھے۔ لوگوں نے انھیں گھیر لیا۔ تھانیدار صاحب نے بیانات لئے اور چلے گئے میں نے محسوس کیا کہ پاپا میرے وہ پاپا جو بڑے خوش مزاج تھے۔ آج ان کا مزاج چڑچڑا سا ہو گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی۔

دوسرے دن رات کے وقت ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے پاپا کچھ اُداس تھے۔ ممّی نے کہا:-

"دیکھا سادھو بابا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ حادثہ ہونے والا ہے۔"

"بھاڑ میں جائے تمہارے بابا کا باپ!"

"اگر تم بھی کچھ خیر خیرات اور دان پُن کرتے رہتے تو کاہے کو ایسا ہوتا؟"

"میں کہتا ہوں چُپ رہو جی! اگر میں ایسا ہوتا تو آج گھر کا صفایا ہی تھا۔"

میں نے پاپا کے مزاج کی گرمی محسوس کر لی۔ سوچا کہ چُپ چاپ اُٹھ کر کھسک جاؤں اگر کہیں پاپا اور ممّی کا جھگڑا بڑھا تو پھر مجھے رونا پڑے گا۔ لیکن اسی وقت بھگوان نے ننھی الکا سے ایسی بات کہلوا دی کہ جتنی اس کی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ بول پڑی۔

"ایک منت پاپا۔ پہلے ام آنکھیں بند کرلیں تو لائیے"۔ سنکر پاپا اپنا غصہ بھول گئے اور میں بھی کھکھلا پڑا۔ ممّی نے اُسے کھینچ کر گود میں بٹھا لیا۔ میں نے دل ہی دل میں الکا کو بڑی ہی دعائیں دے ڈالیں۔ کسی کہنے والے نے سچ ہی کہا ہے کہ کبھی کبھی بچوں کی بھولی باتیں والدین کے بڑے بڑے جھگڑوں کو ٹالنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

دوسرے دن جب صبح سادھو بابا ہمارے گھر آئے تو پاپا گھر ہی پر تھے۔ پاپا کے بارے میں میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ سادھوؤں سے لاکھ بیزار سہی لیکن اگر کوئی سادھو گھر پر آجائے تو وہ بڑے احترام سے پیش آتے ہیں۔ چنانچہ بابا جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ ممّی نے کہا :۔

"بابا جی! یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔"

"میں سب جانتا ہوں"۔

"آپ نے اخبار میں پڑھا ہو گا" پاپا نے پوچھا۔

"نہیں پاپا۔ بابا جی نے اپنے دھیان گیان سے پتہ لگا لیا ہو گا۔ کیوں نا بابا جی" میں نے پوچھا۔

سادھو بابا میری یہ طنز کی بات سمجھ گئے۔ مسکرا کر بولے۔ "ٹھیک ہے بیٹا! میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تجھے بائیسکل مل جائے گی!"

کہاں سے ملے گی بابا جی؟" میں نے جھٹ پوچھا۔

"کہیں نہ کہیں سے مل ہی جائے گی پولیس والے تلاش کر ہی رہے ہیں"۔

"اور اگر پولیس والے نہ تلاش کر سکے تو ماں باپ ہی سے مل جائیے گی۔کیوں نا باباجی!"
پاپا نے کڑی چوٹ کی لیکن باباجی اس بات کو پی گئے۔" بائیسکل کہیں کنویں میں ملے گی"
یہ کہہ کر باباجی سنبھل کر بیٹھ گئے اور انھوں نے اپنا آسن ٹھیک کیا۔

ان کے جانے کے بعد پولیس والا خبر لے کر آیا کہ سائیکل مل گئی ہے پوچھا گیا۔
کہاں ملی ہے" تو بتایا کہ نواب باغ میں کنویں کے اندر"۔

پاپاجی ہکّا بکّا ہو کر رہ گئے۔ ممّی کو اس سے اچھا موقع اور کب مل سکتا تھا۔
بولیں۔ دیکھا میں جو کہتی تھی کہ بابا ٹھیک ہی کہتے ہیں لیکن تم کو وشواس ہو تب تو!"

اس بار میں اور پاپا کوئی جواب نہ دے سکے۔ پولیس والا کہہ رہا تھا:۔
"دیکھئے آج کل شہر میں چوریاں بہت ہونے لگی ہیں آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ کل
ڈپٹی کلکٹر کے یہاں بھی چوری ہو گئی تھی۔اس سے پہلے دو چوریاں ہوئیں۔ دونوں
بڑے بڑے افسروں کے یہاں۔ ایسے چالاک ہیں چور، آج تک پتہ نہ چلا"۔

"رام رام! ان کی پتنی تو بڑی دھرم دان ہیں۔ بڑا پُن دان کرتی ہیں پھر بھی......"
تم بھی تو بڑی دھرم دان ہو" پاپا نے پھر بات ماری اور ممی کچھ سوچ کر چپ رہ گئیں

اب پاپا ہر وقت فکر میں رہنے لگے۔ انھوں نے پہلے تو کچھ نہیں بتایا۔لیکن جب
ان کا تبادلہ ہو گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ تبادلہ کا آرڈر آنے سے پہلے یہ ضرور ان کی
زبان سے سنا تھا کہ اس جگہ اور اس شہر کے لوگوں سے مجھے سخت نفرت ہو گئی ہے۔
سمارو کو نوٹس دے دیا گیا۔ ممّی تو چاہتی تھیں کہ وہ ساتھ چلے لیکن پاپا نے صاف

انکار کر دیا۔ سمارو نے بتایا کہ اب وہ اپنے گاؤں چلا جائے گا۔ یہاں نہ ایسی دھرماتما مالکن ملے گی اور نہ میں رہوں گا۔ وہ بھی اپنے گاؤں کو جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

کار میں سامان لَد گیا۔ ابا جان نے کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چل کر پٹرول بھروا لیں۔ پٹرول پمپ پہنچے تو ممی نے کہا۔ اب ادھر آئے تو ذرا اور آگے بڑھالو چلتے وقت باباجی کے درشن کر لیں۔ پاپا نے ممّی کی زبان سے یہ سنا تو ماتھے پر شکن پڑ گئی لیکن ممی کی بات نہ ٹال سکے۔ کار کا رُخ باباجی کی کٹیا کی طرف کر دیا۔ منٹ بھر میں کٹیا کے سامنے سڑک پر کار جا رکی۔ ہم سب اُترے۔ سڑک سے پیدل ہی کٹیا کی طرف چلے۔ پاس پہنچے تو یک دم سب رُک گئے۔ کٹیا کے آگے ہماری طرف پیٹھ کئے سادھو جی بیٹھے بھنگ کے دم لگا رہے تھے اور بغل میں سمارو بیٹھا ہوا چلم پی رہا تھا اور بابا سے کہہ رہا تھا۔

"لو، ان کی بدلی ہو گئی اور وہ چلے گئے۔"

بس یہی سُن کر ہم سب لوگ رک گئے اور سوچنے لگے کہ سمارو یہاں کیوں ہے پھر سنائی دیا۔ باباجی کہہ رہے تھے: جانے دے ان کو۔ تو نے اچھا کام کیا۔ ویسے بھی میرے ایجنٹ تیری طرح دوسرے بڑے گھرانوں میں نوکر ہیں۔ کہیں نہ کہیں پھر تجھے چپکا دوں گا۔"

میں نے وقت وقت پر اس گھر کی ایک ایک بات آپ کو بتا دی تھی میں سمجھتا ہوں کہ اچھی جاسوسی کی میں نے اچھا خاصہ بے وقوف بنایا ان کو۔"

"یہ تو ہمارا دھندا ہی ہے۔"

"گروجی۔ وہ چوری کا مال بکا یا نہیں۔"

"ابھی تو نہیں بکا۔ سائیکل تو واپس ہوگئی۔ برتن بیچنے کے لئے مراد آباد بھیج دئے گئے ہیں اور سلائی مشین بریلی کو پرزے تبدیل کرانے۔ اور بھی سامان ہے۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب کے یہاں کا اور دوسرے مکانوں کا بھی۔

"گروجی! میری ہتھیلی میں کھجلی ہو رہی ہے۔ آج کہیں بھاری رقم ملنی ہے۔"

باہر کھڑے ہوئے میں نے ممّی نے اور پاپا نے یہ باتیں سنیں۔ پاپا نے دبی زبان سے کہا۔ "رقم نہیں، تیرے ہاتھوں کو ہتھکڑیاں ملیں گی۔ اور یہ کہہ کر وہ واپس ہوئے تو ممی اور میں دونوں پیچھے پیچھے چلے۔ آ کر کار میں بیٹھے پاپا سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچے۔ پھر کیا ہوا؟" ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اب کیا ہوا ہو گا۔ پھر پولیس نے کٹیا پر چھاپا مارا۔ چوری کا بے شمار مال برآمد ہوا۔ پھر مقدمہ، پھر بابا کے پورے گروہ کا صفایا وغیرہ۔

لیجئے کہانی کے آخر کا حصہ مختصر کر کے میں نے کہانی کو ختم کر دیا۔ یہ کہانی ایک ہندی رسالے سے لی ہے۔ اس کہانی میں ہندوستان کے ایک رستے ناسور کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن ہم سادھو بابا کے نام کے بدلے پیر جی اور ان کی معتقد فیملی کے بدلے کسی مسلمان گھرانے کا ذکر کر دیں۔ تو یہی کہانی اس ماحول کی ترجمانی کرنے لگے جو پیر پرست اور دین سے ناواقف مسلمانوں کا ماحول ہے۔ آپ سوچئے کیا ہمارا سماج ایسے لوگوں سے خالی ہے جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ: ہیں یہ کچھ لیکن نظر آتے ہیں کچھ ـــ!

صلح کا فرشتہ

کھیلتے کھیلتے ننھے سعید کے گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس نے ٹوٹی ہوئی ٹانگ اُٹھائی۔ اب دیکھنے لگا۔ یہ کیسے جڑے۔ وہ سوچتا رہا پھر دوڑا اپنی امی کے پاس گیا اس کی امی اپنے کمرے میں منہ لپیٹے پڑی تھیں۔ "امی! اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

اس کی امی نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے انھوں نے جھڑک دینے والے انداز سے کہا۔ "میں کیا کروں، میرا دل خود ٹوٹ گیا ہے"۔

بھولا سعید کچھ نہ سمجھا۔ وہ ذرا دیر کھڑا رہا۔ مطلب پورا نہ ہوتے دیکھ کر وہ اپنے ابا کے کمرے کی طرف گیا۔ اس کے ابا آرام کرسی پر اُداس بیٹھے تھے۔ نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔ ننھا ان کے پاس گیا۔ "ابو میاں! دیکھئے یہ ٹوٹ گیا"۔

"تو میں کیا کروں! میرا دل خود ٹوٹا ہوا ہے"۔ اس کے ابا نے بھی وہی جواب دیا وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ ذرا دیر کھڑا رہا۔ سوچتا رہا پھر برآمدے میں آیا۔ اس نے کپڑے کے کچھ چیتھڑے اکٹھا کئے۔ اپنے ڈبے سے ڈور نکال لایا اس نے ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو ٹوٹی ہوئی جگہ پر رکھ کر ڈور سے باندھ دیا اس کے بعد گھوڑے کو کھڑا کیا تو ٹانگ

الگ ہو گئی اور گھوڑا ایک طرف گر گیا۔ اس نے جھٹ ہاتھوں پر سنبھال لیا وہ پھر سوچنے لگا۔

وہ ایک لوٹے میں پانی لے آیا۔ باورچی خانے سے تھوڑا سا آٹا لایا۔ آٹا پانی میں گھولا اپنے خیال میں اس نے لئی تیار کر لی۔ اس مٹی سے اس نے ٹانگ کو چپکا کر پھر چیتھڑے لپیٹے اور ڈورے سے باندھ دیا۔ اس کے بعد گھوڑے کو کھڑا کیا۔ گھوڑے کی ٹانگ پھر الگ ہو گئی وہ گرنے لگا تو سعید نے پھر سنبھال لیا۔ بے چارہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔

وہ پھر امی کی طرف بھاگا۔

"امی! نہیں جڑتا۔"

ابھی اس کی امی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ صحن سے اس کے ابا کی آواز آئی۔

"اچھا تو محترمہ! سنبھالئے اپنا گھر میں نے آپ کے حقوق ادا کرنے میں اپنی مقدرت سے بڑھ کر حصہ لیا لیکن تمہارے جائز اور ناجائز سارے خرچ برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ تم کو تو کسی نواب سے شادی کرنی تھی۔

آخری جملہ سن کر سعید کی امی تڑپ گئی۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"میرے باپ نے تو آپ ہی کو نواب سمجھا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ نواب خزانے کا سانپ ہے۔ آپ نے کب اور کون سا ارمان میرا پورا کیا جب کچھ کہا۔ خالی جیب دکھائی آپ کیوں گھر چھوڑیں گے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔

میں خزانے کا سانپ ہوں؟"

"تو آپ نے نواب سے شادی کرنے کا طعنہ کیوں دیا؟"

اس طرح کی جھڑپ سُن کر سعید پھر وہاں سے اپنی دھن میں بھاگا۔ اب کی بار وہ اپنے ابا کے کمرے میں گیا۔ میز سے گوندانی اُٹھائی۔ اس نے گوند سے گھوڑے کی ٹانگ جوڑی پھر چیتھڑوں سے لپیٹ کر تاگے سے باندھا۔ تھوڑی دیر دیکھتا رہا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں اس کے آبا اور امی میں تو تو میں میں ہو رہی تھی۔ سعید کو اس جھڑپ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب آوازیں ذرا کرخت ہو جاتیں تو وہ ادھر دیکھ تو لیتا لیکن اُسے اپنے گھوڑے کی ٹانگ کی فکر تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو کھڑا کیا تو وہ کھڑا رہا۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ اس کی ماں بُرقع اوڑھ کر برآمدے کے برابر سے یہ کہتی ہوئی نکلیں۔ ”روز روز کے یہ ٹھو کے کون سنے میرے باپ دو روٹیوں کے لئے اُکتا نہ جائیں گے۔ سعید نے دیکھا کہ امی ڈیوڑھی تک پہنچ گئیں۔

”میں کہتا ہوں کہ اس کا انجام اچھا نہ ہو گا“ یہ سعید کے ابا کی ڈانٹ تھی۔ سعید نے اس ڈانٹ کو اہمیت نہ دی۔ وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں تھا۔ اس نے گھوڑے کی ٹانگ جوڑ لی تھی۔ اس نے خوشی میں گھوڑے کو اُٹھایا اور یہ کہتا ہوا امی کی طرف دوڑا۔

”امی جڑ گئی۔ امی! جڑ گئی۔ یہ دیکھو! یہ اب نہیں گرتا۔“ سعید نے زمین پر گھوڑے کو کھڑا کر دیا۔ ”دیکھو امی! جڑ گئی نا!“

وہ دادطلب نظروں سے کبھی امی کی طرف دیکھتا کبھی ابا کی طرف۔ وہ جڑ گئی جڑ گئی کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ اس کی امی کے قدم رک گئے۔

”میرے لال! تو نے اس کی ٹانگ جوڑ لی۔ کوئی میرا ٹوٹا ہوا دل جوڑنے والا نہیں“۔

"آپ ہی کا دل ٹوٹا ہے۔ میرا تو سالم ہے نا !"

سعید کی امی اس کے جواب میں کچھ کہنے والی تھیں کہ سعید بول اُٹھا۔

"مجھے دیجئے اپنا دل ! میں جوڑ دوں گا"

"تو کاہے سے جوڑے گا ؟"

"ابا کی گونددانی سے !"

"ابا کی گوندانی سے !" سعید کی امی یکدم ہنس پڑیں۔ دوسری طرف مردانے کمرے سے بھی قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاں بیٹے لے، میری پوری گوندانی حاضر ہے۔ دونوں دل جوڑ دے۔"

"ایک ذرا سے بچے نے ٹوٹی ہوئی ٹانگ جوڑ لی۔ ان سے دل نہیں جڑتا"

"جڑتا کیوں نہیں۔ کوئی جوڑنے والا ہو" اور یہ کہتے کہتے سعید کے ابو میاں گوندانی لئے ہوئے کمرے سے نکلے۔

"یہ کھڑا ہے میرا گھوڑا ابو میاں ! اب میں اس پر سوار ہو سکتا ہوں"

بیٹا ! تیری ماں سے تو نہ ہو سکا لیکن تو نے میرا دل جوڑ دیا" اور یہ کہہ کر سعید کے ابو میاں نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ مسکرا کر بیوی سے کہا " جاؤ کیوں نہ میکے"

"جاؤں گی تو سعید کو لے کر جاؤں گی"

"کیوں ؟ یہ میرا بیٹا ہے"

"میں بھی اس سے اپنا دل جڑواؤں گی"

"لاؤ امیّ! یہیں جوڑدوں۔"

"شاباش بیٹیا ٹھیک ہے!" اور یہ کہہ کر سعید کے ابو نے بیوی کا بُرقع اُتار کر پھینک دیا۔ اور پھر؟؟

اور پھر کا جواب ہم سے نہ پوچھئے، یہ ان سے پوچھئے جن کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے کہ: ؎

بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

جھوٹے سہارے

آبادی سے دور بہت دور ایک میدان میں جہاں ہر وقت آندھی اور بارش کا کھٹکا لگا رہتا ہے میں نے ایک ڈھیلے اور پتّے کو دیکھا دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جی ہاں! باتیں کر رہے تھے۔

پتہ: دوست میں آندھی سے بہت گھبراتا ہوں۔ میرے دوست! آندھی آئے تو تم میری مدد کے لئے میری پیٹھ پر بیٹھ جانا۔ اس طرح میں آندھی کی زد سے بچ جاؤں گا۔ وہ مجھے اُڑا کر نہ لے جاسکے گی۔"

ڈھیلا: بارش میری جان کے پیچھے پڑی رہتی ہے جہاں مجھے دیکھا برس ہی تو پڑی اور پھر مجھے ختم کر ڈالتی ہے لیکن دوست، اب مجھے کاہے کا ڈر ہے مجھے تم جیسا ساتھی مل گیا۔ تم چھتری بن کر مجھے ڈھانپ لو گے۔ مجھے بارش کے بے رحم ہاتھوں سے بچا لو گے۔ سمجھ گئے نا!"

میں حیران تھا کہ یہ بے جان چیزیں باتیں کر رہی ہیں اور باتیں بھی کیسی، دور اندیشی کی۔ دونوں بہت اچھے ساتھی ہیں — لیکن تھوڑی دیر بعد — میں نے آندھی کی

سنسناہٹ اور پھر سرسراہٹ اور پھر خنکی محسوس کی اور پھر آسمان ابر آلود دیکھا اور پھر دیکھتے دیکھتے بادل گڑگڑانے لگے۔ یہ سب اتنی جلد ہوگیا کہ میں اسے منٹ کے حصوں میں تقسیم کروں تو آپ اُسے خواب ہی مانیں گے لیکن سنئے تو ہوا کیا جب آندھی کی سرسراہٹ ہوئی تو واقعی پتّہ ڈھیلے سے اس طرح لپٹ گیا کہ آندھی کا اُسے ڈر نہ رہا اور ڈھیلے نے سمجھ لیا کہ اب وہ بھی بارش کے پانی سے بچ جائے گا لیکن جب پانی بہتا ہوا چلا تو ڈھیلا اس سے پگھلنے لگا۔ وہ پگھل گیا اور پھر پانی پتے کو بہا لے گیا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل نے پکارا : ؎

"سب جھوٹے سہارے ہے۔ سہارا بس ایک، اور وہ ہے — خدا کا۔"

میری آنکھیں کھل گئیں۔ جانے یہ خواب تھا یا بیداری۔ بہرحال کچھ ہو میری آنکھیں کھل گئیں۔

(ایک انگریزی افسانے سے استفادہ)